کیمپ میں بچہ
نبی احمد

کیمپ میں بچہ

نبی احمد

کیمپ میں بچہ

(افسانوی مجموعہ)

نبی احمد

زیر اہتمام

حالی پبلی کیشن، 6/275 للتا پارک، لکشمی نگر، دہلی-110092

نام کتاب: **کیمپ میں بچہ**
ناشر و مصنف: نبی احمد
پتہ: C/o MUGHAL PAN CENTRE
60, KHUREJI BUS STOP
DELHI-110051
Mob. ~~09110017937~~
زیر اہتمام: حالی پبلی کیشن
سن اشاعت: 2006
تعداد: چار سو
قیمت: 100 روپے
کمپوزنگ: حنا کوثر (9313074283)
مطبع: نیو پرنٹ سینٹر 1/2861 کوچہ چیلان
دریا گنج، نئی دہلی۔110002

ملنے کے پتے

☆ حالی پبلی کیشن، 6/275 للتا پارک لکشمی نگر، دہلی۔110092
☆ مغل پان سینٹر، 60 خوریجی بس اسٹاپ، دہلی۔110051
☆ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔800004

انتساب

امی جان

نسیمہ خاتون (مرحومہ) کے لیے

فہرست

پیش لفظ

مجھے پڑھنے لکھنے کا شوق بچپن سے ہی رہا لیکن تب میں اپنے شوق کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا تھا، میرے راستے میں دیواریں حائل تھیں۔ ایک طرف اپنوں میں جہالت اور دوسری طرف سخت مزاج والد صاحب۔ مجھے وہ زمانہ اچھی طرح یاد ہے۔ شاید 75-1970 کے درمیان کا کوئی بھی سال رہا ہوگا۔ میں ناول اور افسانے پڑھتا تھا، افسانوں اور ناولوں سے متاثر ہو کر میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھتا تھا اسطرح کئی کئی کاپیاں ان تحریر کی نذر ہو جاتیں تھیں ایک دن میں ناول پڑھ رہا تھا اور اچانک مجھ پر تھپڑ اور ڈنڈوں کی بارش ہوئی اور میں تڑپ اٹھا تھا۔ اس طرح تھپڑ اور ڈنڈوں سے ''سواگت'' کرنے والے کوئی اور نہیں میرے والد مرحوم تھے، پھر کچھ ہی لمحوں بعد میرے کانوں سے آواز ٹکرائی تھی۔ ''دیکھو...... دیکھو...... یہ ناول پڑھ رہا ہے۔...... لوفر بنے گا...... لوفر......'' والد مرحوم نے میری والدہ (مرحومہ) سے کہا تھا اور ایسے موقعوں پر والدہ مرحومہ کم وبیش میری حمایت کرتی تھیں دراصل میرے والد صاحب شخص مزاج کے ساتھ ساتھ قدیم خیال تھے۔ وہ ناول افسانے او رفلموں کو برا سمجھتے تھے۔ اس حادثے کے بعد جیسے میں گم ہو گیا اور اپنے آپ کو کھوتا چلا گیا۔ پھر اپنی تلاش شروع ہوئی اور گزرتے وقت نے مجھے اپنے گھر سے دور کر دیا۔ اسی درمیان میرے دل سے صدائیں اٹھتیں...... تم کون ہو؟ تمہاری پہچان کیا ہے۔ تمہیں کچھ لکھنا چاہئے۔...... کس دنیا

میں گم ہو گئے ...... اور میں خود کو تلاش کرنے لگتا۔ وقت کا پہیا، گھومتا رہا لیکن میری تلاش پوری نہیں ہوئی۔

میں باعث بے روزگاری صوبہ بہار سے ہجرت کر کے دہلی چلا آیا۔ یہاں بھی کافی عرصہ تک زندگی کے ناہموار راستوں پر بھٹکتا رہا اور اس بھاگ دوڑ کے درمیان مشرف عالم ذوقی، نند کشور وکرم، انیس امروہوی، راجندر یادو، آچاریہ سارتھی شاعر ساحر داؤ دنگری، انیس امروہوی، ابرار رحمانی اور دوسرے ادیبوں اور مدیران سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ اور پھر میں ادب کی خاردار وادیوں میں بھٹکنے لگا۔ ایک دن میرے دل سے پھر صدائیں اٹھیں ...... نبی احمد! تم جس خاردار وادی میں بھٹک رہے ہو...... یہیں کہیں تمہاری منزل پنہاں ہے...... لیکن یہ ادبی سیاست کی وادی ہے...... اس سیاست کی وادی میں تمہیں ماتیں بھی ملیں گی ...... مگر گھبرانا نہیں...... اسی وادی میں تم خود کو تلاش کرو...... اور گمشدہ نبی احمد کا نصف وجود سچ مچ اسی وادی میں ملا۔

ایک دن ذوقی نے مجھ سے کہا ...... لکھیے...... آپ لکھتے کیوں نہیں...... آپ میں جو جذبہ ہے وہ بہت کچھ ادب کو دے سکتا ہے۔ لیکن میرے مزاج میں شروع سے دبو پن اور احساس کمتری سمایا رہا۔

شوق اور جذبوں کو یہی دبو پن اور احساس کمتری نے سلائے رکھا اور میں صرف ایک اردو ہندی مترجم کی طرح جانا جانے لگا۔ اسی درمیان مترجم افسانہ کے حوالے سے مجھے کملیشور جی کا خط ملا۔ اور میرے سوئے ہوئے جذبوں میں امید کی کرن جاگی اور میں نے

افسانہ 'ماسٹر جی' کی تخلیق کی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے میں ہندو پاک کے رسائل میں شائع ہونے لگا۔

زیر نظر میرا پہلا افسانوی مجموعہ 'کیمپ میں بچہ'' گیارہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ 'کیمپ میں بچہ'' اور 'ایک لاش آپ کی منتظر ہے'' جیسے افسانے میں نے گجرات حادثہ سے متاثر ہو کر قلمبند کیا۔ ان افسانوں میں ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد ویسے جملوں سے گریز کیا ہے جو باعث تکلیف ہو۔

افسانہ ''ماسٹر جی'' ''بھاگلپور فساد کو دھیان میں رکھتے ہوئے قلمبند کیا ہے جب بیوی بچے اسی فسادہ زدہ شہر میں تھے اور میں ان سے ملنے جارہا تھا۔ دوران سفر میں کسی طرح چار اجنبی کو دیکھ کر خائف تھا اور کیسے یہ خوف کا لمحہ سفر ختم ہوتے ہوتے دور ہو جاتا ہے اور زندگی خود بخود مسکرا اٹھتی ہے۔

فاصلے، نیا زمانہ، ظلمت کدہ، تبدیلی اور راگنی پریکشا جیسے افسانے کسی نہ کسی موضوع پر قلمبند کیے گئے ہیں جس میں ''نیا زمانہ'' پاکستان میں بے حد مقبول رہا۔

''تصویر بولتی ہے'' ''باہر نکلو خواب سے'' اور ''گود'' بھی اچھے افسانے ہیں۔ لیکن ان افسانوں میں، میں نے کافی محنت کی۔ ان افسانوں میں جیسی ادبی زبان میں نے استعمال کی اور اس پر مجھے عبور حاصل نہیں تھا۔ بارہا اسے لکھتا اور ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیتا۔ ایک ایک جملے پر بار بار غور کرتا اسے رڈ کر بار بار لکھتا۔ ایسا درجنوں بار ہوا تب جا کر اسے افسانے کا روپ دے سکا۔

ان تینوں افسانے کے علاوہ باقی سبھی افسانے ،جس کا تذکرہ میں اوپر کر چکا ہوں ،اس تحریر پر مجھے پورا عبور حاصل ہے۔اب قارئین کو فیصلہ کرنا ہے کس طرز کی بیان تحریر پسند کرتے ہیں ۔قاری کے پسند اور ناپسند کے بعد ہی نصف گمشدہ نبی احمد ادب کی خاردار وادیوں کی سیاست میں خود کو مکمل کرنے کے لئے براجمان ہوسکتا ہے۔

خاکسار

نبی احمد

ماسٹر جی

سنو ابھی سفر شروع نہیں ہوا ہے شاید!

نہیں۔ سفر ختم ہو چکا ہے۔ ختم ہو چکا ہے سنو۔ لیکن ٹھہرو۔ یہ تم کہاں جا رہے ہو۔ میں پلیٹ فارم پر کھڑا ہوں۔ خوفناک آوازیں چاروں طرف سے مجھے گھیر رہی ہیں۔ وحشت زدہ کرنے والی آوازیں مجھ پر شب خون مار رہی ہیں۔

کوئی نہیں بچے گا۔ سب مارے جاؤ گے۔ مارے جاؤ گے سب کے سب......'

'کون مارے گا......'

'وہی خوفناک چہرے والے'......وہی بے ہنگم آوازیں......شور اور قیامت کے منظر۔

میری گاڑی ابھی لیٹ ہے۔

پلیٹ فارم کے دوسری طرف سے شتابدی ایکسپریس شور کرتی ہوئی گذر گئی ہے۔ چھک چھک کی آوازیں اب بھی میرے کانوں میں زہر گھول رہی ہیں۔

مجھے سب کچھ یاد آ رہا ہے۔ کب کی بات ہے۔

شاید......شاید یہ کل کی بات ہے۔ آنکھوں کے نقشہ میں بھاگلپور اُترتا ہے۔ خون میں ڈوبا ہوا بھاگلپور............ سارے منظر ایک ایک کر کے آنکھوں کی Retina پر دوڑتے چلے جاتے ہیں............

ان دنوں بھاگلپور میں شدید فساد برپا ہوا تھا۔ ہزاروں بے قصور تشدد کے شکار ہوئے تھے۔ کتنی ماؤں کی گود اجڑ چکی تھی۔ کتنی سہاگنوں نے بیوگی کے لباس پہن لیے تھے۔ اور اپنی پیشانی سے افشاں پوچھ ڈالا تھا۔ لڑکیوں کی عصمت لوٹی گئی تھی۔ بچوں کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے تھے۔ میں اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میری بیوی بچے، کہاں ہونگے، میرے بچے، خوف میں نہائے بچے۔ ڈاک سے بھی رابطہ نہیں ہو پایا تھا۔ کسی اپنے کے یہاں فون بھی نہیں تھا۔ آدھے گھنٹہ کا انتظار بھی میرے لیے بھاری پڑ رہا تھا۔

میں ٹہلتا ہوا ایک ٹی اسٹال پر کھڑا ہو گیا۔ سردی کا احساس ہونے لگا۔ اپنے بیگ سے شال نکال کر جسم پر ڈال لیا اور ایک پیالی کافی خریدی۔ دو تین چسکیوں سے ہی کچھ راحت ملی۔ بمبئی بھاگلپور جنتا ایکسپریس آنے کا اعلان ہوا۔ میں نے ایک بار پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔ گھڑی کی سوئیاں ٹھہر گئیں ہیں۔ وقت بھی جیسے چلتے چلتے رک سا گیا ہے۔

مجھے گھر یاد آرہا ہے۔..... گھر..... میرا اپنا گھر......... محبت کا پاگل پن کیسا ہوتا ہے اور جنون....... گھر سے لپٹی ہوئی چاہتوں کی ڈوریاں...... بچوں کی آوازیں گونج رہی ہیں........ میں دعاؤں کے شجر اگاتا ہوں۔ پروردگار سب کو محفوظ رکھنا۔ اپنی امان میں رکھنا۔ لیکن... دل قابو میں نہیں ہے۔ پتہ نہیں بیوی بچے کس حال میں ہونگے۔ ابھی تک وہاں حالات ناساز گار ہیں۔ اخبار کے مطابق جگہ جگہ لاشوں کے ڈھیر اب بھی مل رہے ہیں۔ جس کو موقع ملتا وہ کام تمام کر لیتا۔ شہر کا امن چھلنی چھلنی ہو گیا

ہے۔صبح سورج طلوع ہوتے ہی سہمی سہمی خبریں موصول ہوتی ہیں۔کئی زندگیاں موت کے گھاٹ اتاردی گئیں۔کتنی ہی لاشیں کھیتوں میں دبی مل رہی ہیں۔

کیا ہم سچ مچ آزاد ہیں۔یہ کیسی آزادی ہے۔ہم یہ کیسی آزادی کا جشن منا رہے ہیں۔سب جیسے لاشوں کے ڈھیر پر کھڑے ہیں۔

میں گھڑی دیکھتا ہوں۔ٹرین نہ جانے کب آئے گی۔میری بیوی،میرے بچے۔اللہ سب کو محفوظ رکھیو۔میں ایک بار پھر خوف زدہ ہو گیا ہوں۔ساری دنیا میرا گھر بن گئی ہے۔

فرقہ پرستی نے پورے وطن میں دشمنی کے بیج بودیئے ہیں۔وطن آگ میں جھلس رہا ہے۔حکومت امداد کا اعلان کرتی ہے مگر فساد سے متاثر لوگوں تک پہنچتے پہنچتے اس کا کچھ ہی حصہ رہ جاتا ہے۔شاید اصل حقدار کو ان کا حصہ مل پاتا ہے۔

ٹرین آگئی ہے۔بھیڑ خالی خالی کیبن کی جانب بھاگتی ہے۔جوق در جوق لوگ۔میں کسی سے ٹکراتا ہوں۔سنبھلتا ہوں۔پھر گاڑی کے اندر داخل ہو جاتا ہوں۔کمپارٹمنٹ میں کافی رش ہے۔جگہ مل گئی ہے۔ٹرین چھک چھک روانہ ہوگئی ہے۔لیکن میں کچھ بھی دیکھ نہیں پا رہا ہوں۔۔بیوی،بچے...... ساری دنیا اچانک چھوٹا سا گھر بن جاتی ہے۔گھر جہاں میرے بیوی بچے رہتے ہیں۔ٹرین جھٹکے سے رکتی ہے۔،پھر چلنا شروع کر دیتی ہے۔

جب میں خیالوں سے بیدار ہوتا ہوں تو ٹرین جمال پور پار کر چکی ہوتی ہے۔پٹنہ سے جمال پور کے درمیان میں نے اپنے آس پاس کے مسافروں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی کہ وہ

کون ہیں؟ کس طرح کے لوگ ہیں اچانک ہی میں چونک جاتا ہوں۔وہ چار ہیں۔ چار جوان لڑکے۔ چاروں مجھے گھورتے جارہے ہیں۔ایک ٹک... پہلے تو میں اتنا ہی سمجھ سکا کہ وہ مسافر نوعمر نوجوان ہیں۔جنہوں نے بہت حد تک اپنے چہرے کو کمبل سے ڈھانپ رکھا ہے۔ان آنکھوں سے نکلتی شعاؤں کا میں سامنا نہیں کر پایا۔عجیب سی بے چینی، اور پھر اپنے جسم میں لہر کی مانند پھیلتی جھرجھری کے احساس سے میں سکڑ گیا ہوں۔دوسری طرف اپنا منہہ موڑ لیا ہے۔

ٹرین تیز رفتار سے چلی جارہی ہے۔ان چاروں کے پاس ایک آدمی بیٹھا ہے۔جس سے کسی بات پر بک جھک ہوگئی ہے۔انہیں میں سے ایک، سخت لہجے میں اس آدمی کو پھٹکار رہا ہے۔وہ بیچارہ خاموش بیٹھ گیا ہے۔تھوڑی دیر بعد پھر میری نگاہ ان چاروں کا جائزہ لیتی ہے۔اب بھی ان کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہیں۔وہ دھیرے دھیرے اپنے ساتھی سے کچھ کہہ رہا ہے۔میرے جسم میں جھرجھری کی جگہ کپکپی سی پیدا ہوئی ہے۔توجہ اس کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کی ہے۔لیکن میرا مکمل وجود اپنے آپ میں اور بھی سمٹ گیا ہے، ساتھ ہی ساتھ پوری طور سے خائف بھی ہوتا جارہا ہوں میری حس یہ سوچنے پر مجبور ہورہی ہے کہ کہیں یہ لوگ فسادی تو نہیں...؟ محض ان کی موجودگی کا احساس پہلی بار مجھے دہشت زدہ کر گیا ہے۔

فساد! اس لفظ نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔میرے ذہن میں ایک واقعہ جی اٹھتا ہے... ہاں! ایک واقعہ۔وہ ماسٹر جی تھے۔میرے جان پہچان والے ماسٹر جی۔ایک دن

ماسٹر جی شام کے وقت سائیکل سے اپنے گھر جارہے تھے۔راستے میں بلوائیوں نے گھیر لیا۔مجھے ایک ایک کر کے ساری خبریں ملی تھیں۔فسادیوں نے ماسٹر جی کوشہید کر دیا تھا۔شام تک وہ گھر نہیں پہنچے تو گھر والوں کوفکر ہوئی محلے والوں کومعلوم ہو چکا تھا کہ وہ جس راستے سے آتے جاتے ہیں اُسی کے درمیانی علاقے میں فساد ہو گیا ہے۔محلے والوں کا قافلہ ان کی خبر گیری کے لئے چل پڑا اور...... راستے میں بری طرح کچلی ہوئی لاش ملی۔چہرا پہچان میں نہیں آرہا تھا۔لیکن کپڑے اور انگوٹھی وغیرہ سے ان کی شناخت ہوئی۔

کہیں یہ چاروں بھی۔خوف میری رگ رگ میں دوڑ رہا ہے۔میں اس خوف سے نجات چاہتا ہوں۔

میں جبراً مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں۔مگر ایسے موقع پر مسکراہٹ بھی جانے کہاں کھو جاتی ہے۔میں تو خود ایک ماسٹر ہوں۔ماسٹر جی...... دن میں سیکڑوں چہرے اچانک سامنے آکر ہاتھ جوڑ دیتے ہیں۔سلام نمستے ماسٹر جی۔لیکن یہ چاروں......

میں خوف کی بارش میں شرابور ہو چکا ہوں۔شاید یہ میرا آخری وقت ہے۔

یہ چاروں سچ مچ فسادی ہیں۔میں نے سفر کا ارادہ ہی غلط کیا۔مجھے آج سفر شروع نہیں کرنا چاہئے تھا۔مگر بیوی بچے...... یہ چاروں مجھے گھور کر دیکھ رہے ہیں۔جیسے مجھے کچا چبا جائیں گے۔اب ان میں سے ایک مسکرا رہا ہے۔

مسکرا کر میری طرف دیکھ رہا ہے۔

ٹرین کسی چھوٹے اسٹیشن پر کھڑی ہوگئی ہے۔شاید آگے جانے کا سگنل نہیں ہے۔

کچھ ہی دیر میں سگنل ہونے پر ٹرین چل پڑی۔ میری نگاہ ایک بار پھر نوجوانوں سے ٹکراتی ہے۔ جو اپنی نگاہوں کا مرکز اب بھی مجھے بنائے ہوئے ہیں۔ پھر میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا ہوں۔لیکن خوف اور گھبراہٹ میں کمی نہیں ہو پا رہی ہے۔ان میں سے ایک نوجوان اٹھتا ہے تو میں اندر سے کانپ جاتا ہوں۔ مجھے لگا کہ اب میرا خاتمہ یقینی ہے ۔کل صبح میری لاش کسی کھیت یا گڈھے میں پڑی ہوگی اور اخبار میں چھپی ہوگی کہ وہ نوجوان جو چہرے سے خوف ناک اور فسادی لگ رہا ہے وہ میرے قریب آکر ٹھٹھک گیا ہے۔وہ......اس کی آنکھوں میں الجھنوں کے بھنور دیکھتا ہوں۔وہ مسکراتا ہوا پوچھتا ہے۔

''کیا آپ بھی بھاگلپور جا رہے ہیں؟؟''

''جی ہاں'' خوف اب مجھ پر طاری ہے۔

''ہم کافی دیر سے آپ کے بارے میں سوچ رہے تھے۔'' وہ آہستہ آہستہ کہتا ہے۔

''دراصل ہم آپ کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔کہیں آپ پیر موہانی اسکول میں۔

آپ ماسٹر جی......؟''

میں ایک دم سے چونک گیا ہوں۔ میں مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر جلدی سے کہتا ہوں۔

''ہاں میں وہی ہوں''

نوجوان مسکرا رہا ہے۔'' آپ نے ہمیں پہچانا نہیں۔پیر موہانی 'منّا بابو......''

پتہ نہیں وہ کیا کیا کہہ رہا ہے۔اب وہ چاروں نوجوان ایک ساتھ کچھ کہے جا رہے

ہیں۔میرے اندر طوفان آ گیا۔ ہنستا مسکراتا طوفان میں خوف سے باہر نکلنے کی کوشش کر
رہا ہوں

وہ چاروں عجیب نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

ٹرین ایک جھٹکے سے رک گئی ہے۔

شاید جنکشن آ گیا ہے۔

تصویر بولتی ھے

چہروں کا کیا ہے۔چہرے بھی کتنے جھوٹے ہوتے ہیں۔ کتنے جھوٹے کتنے سچے۔کبھی کبھی انسان ان چہروں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

شاید ارپنا بھی اسی ،ایک چہرے، میں الجھ کر رہ گئی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنے آپکو سمجھانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔کبھی کبھی وقت امتحان لیتا ہے اور ہم کٹھ پتلیاں بن جاتے ہیں۔

ارپنا کو سب کچھ یاد آرہا تھا۔ یہ بھی، کہ وقت نے اسکے ساتھ کتنا گندہ مذاق کیا تھا۔

☆☆☆

لیکن یہ کہانی کب شروع ہوئی۔ ارپنا کو یہ بھی یاد نہیں۔دن کون سا تھا۔تاریخ کون سی تھی۔صبح کے کتنے بجے تھے۔دھوپ نکلی تھی یا باہر بدلیاں چھائی تھیں۔وہ تیزی سے بستر سے اٹھی تو ہاتھوں سے لگ کر میز کے بائیں طرف رکھا شیشہ کا گلدان ایک جھٹکے سے زمین پر گر کر ٹوٹ گیا تھا چھناک......

وہ جیسے خوف سے سہم گئی۔آنکھوں کے آگے گہرا اندھیرا چھا گیا۔اسے یقین تھا کہ شیشے کی کرچیاں دور دور تک بکھر گئی ہوں گیں۔

لیکن نہیں ،یہ کرچیاں تو وقت نے ،مقدر نے اس کے جسم میں بکھیر دی تھی اور روح میں۔

جاگتی آنکھوں کے ساتھ اسکی آتما لہولہان ہوتی رہی تھی۔

ارپنا کو سب کچھ یاد آ رہا تھا۔

ایک خوشگوار شام۔شام جیسے اس کے وجود میں اتر گئی تھی......وہ خیالوں کے رتھ پر سوار تھی۔قدم آگے کی جانب رواں تھے......سڑکوں کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ٹریفک کی بوجھل آوازوں کا خوف زہر بن کر فضا میں پھیل گیا تھا......پھر۔اسے کچھ یاد نہیں۔ایک زور کی چیخ گونجی۔ایک گاڑی بالکل اس کے قریب آ کر چیخ پڑی۔ہوش میں آنے تک وہ دو مضبوط بانہوں کے درمیان جھول رہی تھی......

وشال۔آپ......اچھی تو ہیں نا۔

☆☆

کبھی کبھی زندگی میں حادثے بھی مسکرا اٹھتے ہیں۔

ایکسیڈینٹ ایک حسین بہانہ ثابت ہوا۔وشال آہستہ آہستہ خاموشی سے اس کے دل میں جگہ بناتا جا رہا تھا۔پھر تنہائی کا روشن دان کھل گیا۔ایک جھماکا ہوا......

یہ بھی وشال تھا......جو روشنی بن کر اس کے وجود کے اندھے کنویں میں اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''آپ تنہا رہتی ہیں......''

''ہاں......''

''اوہ......''وہ اداس تھا......

اس نے آہستہ آہستہ اپنے مہمان کے استقبال کے لئے اٹھنا چاہا۔لڑکھڑائی۔گرنے

گرنے کو ہوئی تو وشال نے تھام لیا۔

اسے پہلی بار اپنی بے بسی کی چیخ سنائی دی۔

''آنکھوں میں یہ اندھیرا کب سے ہے۔''

وہ وشال کی آواز سن رہی تھی۔

آنکھوں میں اندھیرا...... وہ وشال کو کیا بتائے۔ یہ اندھیرا کب سے اس نے اپنی زندگی کا مقدر بنالیا ہے۔ ماں، بابو جی، گھر...... کبھی ایک سندر سپنا، گھر کا تصور ہوا کرتا تھا۔

پھر سب کچھ بکھر گیا۔ ایک حادثہ نے، اس کی آنکھوں میں اندھیرا لکھ دیا۔ اور دوسرے حادثے نے وشال کو اس کی زندگی میں لا کھڑا کیا۔

وہ ٹوٹ رہی تھی۔ ''کبھی کبھی ڈر جاتی ہوں وشال''

''کیوں''؟ آنکھوں کے اندھیرے سے'' وشال ہنس رہا تھا۔ کبھی کبھی جو آنکھ والے ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں زیادہ اندھیرا ہوتا ہے۔ یقین کرو۔ ایک دن تمہاری آنکھوں سے میں اندھیرا دور لے جاؤں گا۔ ہمیشہ کے لئے......

یہ بھی وشال تھا۔ وہ اس کی مسکراہٹ کا لمس، اپنے جسم میں محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

لیکن یہ لمس کتنا اجنبی ثابت ہوا تھا۔ اس کے لئے۔

شاید یہ کہانی پیدا ہی نہ ہوتی۔ جنم ہی نہ لیتی۔ لیکن اس کہانی کو جنم لینا تھا۔ اور اس کہانی نے خاموشی سے ارپنا کے وجود میں جنم لے لیا تھا۔

ایک مہربان شفیق چہرہ۔ کھلے روزن سے روشنی کی ایک موہوم کرن اس کے اندر داخل

ہوئی تھی۔اس کے چہرے کے بارے میں اس نے کتنے سپنے سجائے تھے۔

وہ ہسپتال کے ایک اندھیرے کمرے میں تھی ......اور شاید نہیں اس کہانی کا اختتام لکھا جانے والا تھا۔وشال کی محبت بھری آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔اس سے زیادہ اندھیرا تو......

کھلے روزن سے روشنی کا ایک جھما کا ہوا۔

لیکن سامنے والا چہرہ...... کمرے میں ایک تیز چیخ گونجتے گونجتے رہ گئی...... بیوٹی اینڈ دی بیسٹ، خوبصورتی اور جانور......سامنے جو چہرہ تھا......جیسے کوئی شیشہ چٹخ گیا تھا۔

بیوٹی۔

بیسٹ......

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔بیسٹ جیت گیا تھا۔

اس نے عقیدت کی شمع روشن کر دی......

اور احترام سے اس جانور کے سامنے سر جھکا دیا۔

فاصلے

دشرتھ اور موہن ایک ہی کالج کے اسٹوڈینٹ تھے۔ موہن امیر تھا اور دشرتھ غریب......

اس کے باوجود دونوں گہرے دوست تھے۔ دونوں اپنی پڑھائی پر خوب دھیان دیتے

۔ دونوں کے رزلٹ تقریباً یکساں ہوتے۔ پروفیسر سے اسٹوڈینٹس تک میں دونوں عزیز

تھے۔

دونوں دوستوں میں خوب بنتی تھی۔ دونوں میں اس قدر پیار تھا کہ اس کے بزرگ

، جوڑی سلامت رہنے کی دعا دیتے۔ ایک دن دونوں بہت خوش تھے۔ ہنسی مذاق کا دور چل

رہا تھا۔ موہن نے مذاق ہی مذاق میں دشرتھ کو کہا تھا — میں تمہاری سب سے پیاری اور

خوبصورت چیز چراؤں گا — اور دشرتھ نے مسکرا کر جواب دیا تھا...... چرالینا دوستی کے نام پر

قربان —

دونوں ایکدوسرے کے گھر آتے اور امتحان کی تیاری مل جل کر کیا کرتے۔

انجلی اسی کالج میں ان دونوں سے ایک سال جونئیر تھی۔ جو امیر گھرانے سے تعلق رکھتی

تھی۔ دشرتھ انجلی کو چاہتا تھا۔ لیکن کبھی بھی اس نے ایسا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ اور انجلی سے

کچھ بھی نہیں کہا۔ دشرتھ کی غریبی آڑے تھی۔

دشرتھ اکثر سوچتا مجھے انجلی کے لئے دولت کمانا ہوگا۔ تب ہی اس سے کچھ بتا پاؤں گا۔

دشرتھ کالج سے فارغ ہو کر ممبئی چلا آیا کئی ماہ تک وہ پریشان رہا لیکن نوکری نہیں مل سکی۔

اسے لگا یہ ناکامی انجلی کو پانے کی تمنا سے محروم کردے گی ...... اسے لگا اس کی ڈگریاں جیسے کوڑے کچرے کا ڈھیر ہے۔ پھر بھی وہ اپنی کوشش سے باز نہیں آیا۔

کراؤن انڈسٹریز میں کئی عہدے کے لئے ویکینسی تھی دشرتھ بھی وہاں پہنچ چکا تھا ۔انٹرویو میں وہ کامیاب ہوا۔ اسے نوکری مل گئی تنخواہ اچھی تھی ۔وہ محنت اور لگن سے کام کرنے لگا۔ اب اسے امید کی کرنیں نظر آنے لگیں۔

دشرتھ پہلے اپنا چھوٹا سا آشیانہ بنانا چاہتا تھا۔ اس آشیانہ میں آرام و آسائش کی چیزوں سے بھرپور کرنے کی تمنا تھی ...... وہ اپنے مستقبل کو سنورتا دیکھ رہا تھا ...... اپنا گھر ہے ...... اس میں انجلی ہے ...... دو بچے ہیں ...... دونوں بچے اسکول جاتے رہے ...... اس کا سکھی پریوار ہے ...... یعنی ہم دو ہمارے دو ...... وہ دو سے زیادہ بچوں کی خواہش نہیں رکھتا۔ زیادہ بچہ ہونا بھی غریبی کی علامت ہے اور گھر گرہستی بھی اجیرن ہوجاتا ہے۔۔ اب اس کے مستقبل کا رتھ پیچھے کی جانب مڑ کر حال میں آگیا ہے۔

اپنا گھر ...... انجلی ...... دونوں بچے ......!

دشرتھ مسکرایا اور پھر اپنے کام میں لگ گیا۔

اسے اپنے خواب کو حقیقت میں بدلنا ہے۔ وہ اپنا گھر بنائے گا اور سکھی سنسار بسائے گا۔

ایمانداری اور محنت اس کا شیوہ تھا۔ جس کی بدولت وہ ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا ۔تین سال کی مدت میں اس نے اچھی خاصی رقم جمع کر لی تھی۔ دشرتھ زمین بھی خرید چکا تھا۔

مکان کانٹریکٹر سے اس نے رجوع کیا۔ مکان بننے لگا۔ یہ اس کے خواب کی پہلی منزل تھی۔

ایک دن وہ سنسان علاقے میں اسکوٹر سے گزر رہا تھا۔ اسے کسی خاتون کی چیخ سنائی دی

......دوبارہ ویسی ہی چیخ سنائی دی......وہ چونکا اور اسکوٹر کی رفتار دھیمی کر دی۔

اس طرح چیخ میں اضافہ ہوتا گیا......بچاؤ......بچاؤ......اس نے محسوس کیا، یہ آواز کسی

مصیبت زدہ خاتون کی ہے۔ جو اپنی مدد کے لئے پکار رہی ہے۔

اس نے اسکوٹر روک دی اور آواز کی جانب بڑھا۔ اس نے دیکھا چند غنڈے خوفناک

شکل والے اس خاتون کے ساتھ زور وزبردستی کر رہے ہیں اور خاتون کا کپڑا چیتھڑوں میں

تبدیل ہو گیا ہے۔

دشرتھ نے کسی طرح غنڈوں پر قابو پالیا اور سبھی غنڈے بھاگ گئے۔ اس نے قمیض اس

خاتون پر ڈال دی۔

وہ خاتون مس فلورا تھی......پچیس سالہ مس فلورا کراؤن انڈسٹریز کی مالک......

فلورا مشکور نگاہوں سے دشرتھ کو دیکھ رہی تھی۔

یہ حادثہ اس وقت پیش آیا جب وہ ادھر سے گزر رہی تھی، اچانک کار کا انجن بند ہو گیا

تھا اور کچھ ہی لمحوں بعد غنڈوں نے حملہ کر دیا تھا۔

فلورا کی کار وہیں چھوڑ دی گئی۔ دشرتھ نے فلورا کو اپنے اسکوٹر پر لے لیا۔

فلورا کراؤن انڈسٹریز کی اکیلی وارث تھی۔ اس کے ڈیڈی مسٹر تھامس کی موت کے بعد

سے مسٹر ڈیوڈ کراؤن انڈسٹریز کی نگرانی پوری ذمہ داری سے کر رہے تھے۔ وہ جنرل منیجر

تھے۔

فلورا کو دشرتھ نے بتا دیا تھا کہ وہ کراؤن انڈسٹریز میں ملازمت کرتا ہے، لیکن فلورا نے

اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔

کچھ ہی دنوں بعد دشرتھ کو پرموشن لیٹر ملا۔ دشرتھ کو تعجب ہوا۔۔ وہ حیرت زدہ تھا کہ حال میں تو اس کا پرموشن ہوا ہے اور پھر...... بہر حال وہ کام پوری ذمہ داری محنت اور لگن سے کرنے لگا۔

فلورا دشرتھ کی خبر لیتی رہی ۔لیکن اپنے بارے میں دشرتھ کو کچھ بھی نہیں بتایا۔ دشرتھ کا پورا ریکارڈ اس نے چیک بھی کیا۔اس کی ذات سے انڈسٹریز کا فائدہ ہی ہوا تھا۔فلورا اس کے بارے میں سوچتی رہی اور آہستہ آہستہ اس کے دل میں دشرتھ کے لئے جگہ بنتی گئی۔اسے ایک جوان سہارے کی ضرورت تھی۔اس کے دل میں بنتے جگہ نے پریم کا روپ لے لیا۔

دو دنوں بعد فلورا کا جنم دن تھا اس بار فلورا اپنا جنم دن اپنے گھر پر ہی منانے والی تھی ۔اپنے جنم دن پر اس نے دشرتھ کو بھی انوائٹ کیا۔ پورا ہال مہمانوں سے بھرا تھا دشرتھ بھی پھول اور تحفہ لے کر آچکا تھا۔

فلورا نئے فیشن کا پرکشش لباس زیب تن کئے تھی ۔اس کی نگاہوں نے دشرتھ کو دیکھ لیا تھا۔

فلورا نے ہال میں آ کر مہمانوں کا دھیان اپنی جانب مرکوز کرایا اور وہ سارے واقعات بیان کئے، کس طرح دشرتھ نے غنڈوں سے آزاد کرایا تھا۔

دشرتھ کو اسی وقت پتہ چلا کہ فلورا اکراؤن انڈسٹریز کی مالک ہے اور وہ یہ جان کر حیرت زدہ بھی ہوا تھا۔

فلورا نے بھی دشرتھ کو تحفہ دیا۔تحفہ لیتے ہوئے دشرتھ نے اپنے کپکپاتے لبوں کو جنبش دی

''تھینکس۔''

فلورا نے سارے تحفے قبول کئے سبھی مہمانوں کے سامنے کیک کاٹا۔لوگوں میں کیک تقسیم کیا گیا۔

فلورا نے دشرتھ کو ہر لمحے اپنے ساتھ رکھا اور پہلی بار اس کے دل میں مچلتا ہوا طوفان جوش مار رہا تھا۔یعنی پہلی بار فلورا کے مچلتے جذبے طوفان بن چکے تھے پہلی بار اس کے کنوارے مچلتے جذبوں نے محبت کے ساز پر تھرکنا چاہا۔اس ساز پر تھرکنے والا ساتھی،اس کے خوابوں کا شہزادہ صرف اور صرف دشرتھ تھا۔

جام اور رقص کا دور شروع ہوا۔فلورا دشرتھ کے ساتھ تھرکنے لگی۔اور کچھ سب بھول گئی۔کئی نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔لیکن وہ ان نگاہوں سے غافل تھی۔کیف وسرور میں وہ دشرتھ کا قربت چاہتی تھی۔

دشرتھ فلورا کے ساتھ رقص وسرور مجبوراً کر رہا تھا۔وہ عجب کشمکش میں تھا۔

اچانک دشرتھ کو انجلی کا خیال آیا اور پھر اس کے ذہن میں انجلی سماتی چلی گئی۔فلورا سے اس نے آزاد کیا اور وہاں سے چل پڑا۔

دوسرے دن فلورا دشرتھ سے ملی اور بے رخی کی وجہ دریافت کی۔دشرتھ نے سب کچھ صاف بتا دیا کہ وہ برسوں سے انجلی کو چاہتا ہے اور جو کچھ بھی کر رہا ہے اپنے آپ کو انجلی کے قابل بنانے کے لئے۔

فلورا کچھ لمحے سوچتی رہی اور پھر دشرتھ کو یقین دلایا کہ اب اس کی طرف سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔لیکن دونوں آفس کے بعد دوست کی طرح رہیں گے۔

دشرتھ کا گھر بن چکا تھا۔ اب اس میں انجلی کی سہولت کے مطابق ساری چیزیں قرینے

سے سجائی تھی۔

ایک دن نتا کروز ائیر پورٹ پر دشرتھ کی انجلی سے ملاقات ہوئی اس وقت بھی دشرتھ نے

کچھ بھی نہیں بتایا کیونکہ اسے اپنے خوابوں کی آخری منزل پوری کرنا باقی تھی۔

تین ماہ بعد دشرتھ نے سب کچھ پورا کرلیا۔ اب اس قابل بن چکا تھا کہ انجلی کو اپنے گھر

لے آئے۔

دشرتھ اپنے گھر کی سجاوٹ دیکھ رہا ہے۔ اسی وقت بیل بجی ہے، شاید باہر کوئی آیا ہے۔

وہ لپک کر دروازہ کھولتا ہے۔ سامنے ڈاکیہ کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ ہے۔

لفافہ ڈاکیہ نے دشرتھ کو دے دیا ہے۔ یہ لفافہ بھیجنے والا موہن ہے۔ لفافہ کو دشرتھ نے ہونٹوں

سے چوم لیا ہے۔ اس نے لفافہ کھولا۔ لفافہ سے خط نکالا اور پڑھنے لگا تعلیم سے فارغ

ہونے کے بعد تم کبھی نہیں ملے۔ آخرکار ہمیں تمہارا پتہ مل گیا۔ لیکن کافی تاخیر سے' تمہارا پتہ

اس وقت ملا، جب میری شادی ہو چکی تھی۔ بہرحال میں تمہاری بھابی کے ساتھ ''ممبئی میل''

A/C کلاس، بوگی نمبر...... میں 10 اپریل کو آرہا ہوں۔

خط پڑھ کر دشرتھ بے حد خوش ہوا ہے۔ اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں۔ موہن کے ساتھ

گزرا ہر لمحے دشرتھ کے ذہن میں تروتازہ ہوگئے تھے اور خوشیاں پورے وجود میں سماتی

جارہی تھیں اور یادیں۔ کبھی کبھی پورے وجود میں اترنے والی یادیں خوشیوں کی بہار لے آتی

ہیں۔ دشرتھ ان دنوں کو یاد کرکے بے قابو ہو رہا ہے...... کبھی مسکراتا ہے...... کبھی گنگناتا

ہے...... کبھی ہنسی کی بارش کرتا ہے۔ جیسے دنیا بھر کی خوشیاں سمٹ کر اس کے پور پور میں سما گئی

ہیں۔

دشرتھ دوسرے دن کا بے صبری سے انتظار کر رہا ہے۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیال آ رہے ہیں۔ کل تو گھر میں رونق ہی رونق ہوگی۔ اس کا عزیز دوست موہن کل آئے گا۔ وہ اس سے بتائے گا...... میں انجلی کو کالج کے زمانہ سے ہی چاہتا ہوں۔ اب میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ انجلی میرے گھر کی زینت بن سکے۔ وہ انہی خیالوں میں تھا کہ فلورا آ گئی۔

دشرتھ نے فلورا کو سب کچھ بتا دیا۔ فلورا بھی سن کر بہت خوش ہوئی۔

دوسرے دن دشرتھ اور فلورا پلیٹ فارم پر ہیں دونوں باتیں کر رہے ہیں۔

دشرتھ فلورا کو موہن کے ساتھ گزارے لمحوں کے بارے میں بتا رہا ہے۔ اور دوستی کی تعریفوں کے پل باندھ رہا ہے......

اسے انتظار کا ہر لمحہ بے چین کر رہا ہے۔ دشرتھ بے چینی سے گھڑی دیکھ رہا ہے...... جیسے وقت رک گیا ہے...... جیسے جیسے وقت قریب آ رہا ہے...... اس کی شدت بڑھتی جا رہی ہے...... اس کے موہن کی دلہن کیسی ہوگی...... شاید خوبصورت...... بے حد خوبصورت اس کی انجلی کی طرح۔

انجلی بھی تو بے حد خوبصورت ہے...... چاند کی طرح دمکتا چہرہ...... جیسے کہ وہ جنت کی حور ہو۔ تبھی تو وہ انجلی کو چاہنے لگا تھا...... تبھی تو اسے پانے کے لئے اس نے اتنی جدوجہد کی تھی۔ اس کی آرام و آسائش سے بھرپور ایک آشیانہ بنوایا ہے۔

دشرتھ پھر خیالوں کے رتھ پر سوار ہو چکا ہے۔ موہن جیسے ہی آئے گا...... پہلے اس سے وہ

گلے ملے گا......پھر اپنے گھر لائے گا......ساتھ میں موہن کی پتنی بھی ہوگی......موہن کو اپنے پیار کے بارے میں بتائے گا......پھر سب مل کر انجلی کے یہاں جائیں گے......انجلی ملے گی......اسے سب کچھ بتائیں گے......اپنا عقیدت بھرا پیار سے آشنا کرائیں گے وہ سوچے گی......غور کرے گی......اور پھر......

دشرتھ خیالوں کے رتھ پر سوار ہی تھا کہ ٹرین آنے کا اعلان ہوا ہے......وہ چونک کر کھڑا ہو گیا ہے......

پلیٹ فارم پر کافی رش ہے۔لوگ دوڑتے بھاگتے نظر آرہے ہیں۔

ٹرین پلیٹ فارم پر داخل کر چکی ہے......ٹرین کی رفتار دھیمی ہوتی جارہی ہے......اور پھر ٹرین رک گئی ہے......دشرتھ بے حد بے قرار ہے اور وہ بے صبری میں فلورا کے ساتھ اس کیبن کی طرف بھاگتا ہے جس میں موہن آرہا تھا۔

دشرتھ لوگوں سے ٹکراتا ہے۔سنبھلتا ہے۔کسی طرح کیبن کے قریب پہنچ چکا ہے۔

سامنے موہن نظر آیا ہے......دشرتھ نے موہن کے استقبال میں ہاتھ بڑھایا ہے......

پھر اس نے اپنی بانہیں پھیلا دی ہے......دونوں دوست گلے مل رہے ہیں۔

اچانک دشرتھ کو خیال آیا......یار بھابھی کہاں ہے۔

ایک خاتون کی طرف موہن نے اشارہ کیا ہے، جو ٹرین سے اتر رہی ہے۔

موہن اس خاتون کو دیکھ کر مبہوت ہو گیا ہے۔

کیونکہ وہ کوئی اور نہیں ہے — انجلی ہے — وہی انجلی جس کے ساتھ زندگی کی منزلیں ساتھ ساتھ طے کرنے کی تمنا تھی۔!!!

اگنی پریکشا

نیلا آسمان...... نیلے آسمان میں چمکتا سورج...... پیلی دھوپ میں نہایا میدان...... دوپہر کا وقت...... سناٹے کا عالم تیز اور گرم ہوا...... جلد جھلسانے والی لو...... میدان میں دو کھیلتے بچے......

تپتی دھوپ میں دو بچے گولیاں کھیل رہے تھے۔ ان دونوں کے علاوہ آس پاس کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دونوں بچے بھی ہم عمر تھے۔ ان دونوں میں ایک بچہ بار بار گولیاں جیت رہا تھا اور دوسرا ہار رہا تھا۔ دوسرا بچہ اپنی ساری گولیاں ہار گیا اور رونے لگا۔ وہ پہلے بچے سے بار بار کہتا، میری گولیاں دے دو...... میری گولیاں دے دو...... پہلے بچے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ آخر کار دوسرے بچے نے گولیاں چھیننے کی کوشش کی۔ مگر وہ کامیاب نہیں ہوسکا۔ پہلا بچہ اس سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ وہ دوسرے بچہ کو دھکا دے کر بھاگ گیا۔ دوسرا وہیں روتا رہا۔

دوسرے بچے کی روتے روتے آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔ وہ روتا ہی رہا۔ پھر ایک ہم عمر لڑکی آئی اس نے پوچھا 'تم کیوں رو رہے ہو؟

بچے نے جواب دیا 'خورشید میری ساری گولیاں لے گیا'

'وہ لے گیا یا جیت لیا' اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ کھیل میں تو جیت ہار ہوتی رہتی ہے۔ تمہیں گولیاں چاہئے۔ میں دیتی ہوں۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا...... اچھے بچے کھیل

کے ساتھ ساتھ پڑھائی پر بھی دھیان دیتے ہیں ...... اس لڑکی نے کھیلنے کے لئے گولیاں دیں بچہ خوش ہوگیا۔

دوسرا بچہ عادل تھا۔ اس کو لڑکی اچھی لگی تھی ...... وہ اس کی گولیوں سے جب بھی کھیلا کبھی نہیں ہارا۔ اس کے پاس بہت ساری گولیاں جمع ہوگئیں۔ وہ ان گولیوں کو ایک کارٹون میں جمع کرنے لگا۔ عادل اکثر اس لڑکی کا انتظار کرتا لیکن وہ نہیں آئی۔

عادل کو لڑکی کی کہی دوسری بات یاد آئی' اس نے پڑھنے کے لئے بھی کہا تھا۔ وہ پڑھائی پر دھیان دینے لگا۔ پڑھنے اور کھیلنے کے درمیان شاید وہ پھر مل جائے تو عادل اپنی گولیاں دکھائے گا۔ لیکن وہ نہیں آئی۔

بڑھتی عمر کے ساتھ عادل کا کھیل کم ہونے لگا۔ لیکن وہ جب بھی گولیاں کھیلا، کبھی نہیں ہارا ۔ پڑھائی پر اپنا دھیان مرکوز کیا تو اس میں بھی کامیاب رہا۔ پہلے اس نے دینی تعلیم حاصل کی ۔ قرأت سے قرآن شریف تلاوت کرتا۔ اس کی آواز تلاوت کے وقت پوری فضا میں شیریں بکھیر دیتیں اور سننے والے جھوم جاتے ...... اس کے ماں باپ گھر کے سبھی افراد اور پڑوس والے اس سے خوش تھے۔

عادل آٹھ سال کا ہو چکا تھا۔ وہ نماز کا پورا طریقہ جان چکا تھا۔ پانچوں وقت کی نمازیں ادا کرتا۔ وقت پر دین کی کتابیں پڑھتا اور اسکول بھی جاتا۔

اسکول میں بھی وہ جینیس تھا۔ وہ پڑھنے میں سب بچوں سے آگے تھا۔ اسکول کی طرف سے تعلیمی مقابلہ میں حصہ لیتا۔ اس میں بھی کامیاب ہوتا۔ عادل کے ساتھ ساتھ اسکول کا بھی نام روشن ہو رہا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ وہ اس لڑکی کو بھول چکا تھا۔ اب اس کا

دھیان صرف اور صرف پڑھائی پر مرکوز تھا۔

عادل بی کام کرچکا تھا۔ اس کے ابو نے دریافت کیا......اب کیا ارادہ ہے؟ اور پڑھنا چاہتے ہو......؟

......'اب میں تجارت کروں گا۔ آپ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ آپ کے بڑھاپے کا سہارا بنوں گا......' عادل بولا تھا۔

عادل کپڑے کی تجارت کرنے لگا۔ وہ کپڑے تھوک منڈی سے خریدتا۔ کپڑے کے بنڈل ٹرانسپورٹ میں بک کراتا اور گھر آجاتا۔ دوسرے دن بنڈل وصول کر کے گھر لاتا۔ پھر سائیکل پر گھوم گھوم کر شہر اور گاؤں میں بیچتا۔

دوپہر کے وقت وہ سنسان سڑک سے گزر رہا تھا۔ اُسے آواز سنائی دی' کپڑے والے 'رک جاؤ' عادل رک گیا۔

عادل کو ایک حسین وجمیل جوان لڑکی آتی دکھائی دی۔ قریب آکر اس نے خیریت دریافت کی...... عادل حیرت زدہ تھا۔ اس لڑکی کو تو میں نے کبھی دیکھا نہیں۔ یہ کتنی تپاک سے میری خیریت دریافت کر رہی ہے۔ آخر یہ کون ہے' اُسے جاننے کی جستجو ہوئی' اس نے پوچھ لیا...... ''آپ کون ہیں؟ میں آپ کو نہیں جانتا......''

''آپ مجھے نہیں جانتے' میں آپ کو بچپن سے جانتی ہوں۔ یاد کیجیے۔ میں نے بچپن میں کھیلنے کے لئے آپ کو گولیاں دی تھیں۔ میں وہی لڑکی ہوں'' لڑکی نے اپنے بارے میں بتایا اور پھر بولی'' دوسرے دن ملوں گی۔''

عادل اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ گلی گلی گھوم کر کپڑے فروخت کرنے لگا۔ تھوڑے

وقت میں ہی شام ہوتے ہوتے وہ اچھا خاصہ فروخت کر چکا تھا۔ وہ اپنے گھر کی جانب سائیکل پر رواں تھا۔ پورا راستہ لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا۔

گھر آ کر اس نے اپنی ماں سے بچپن کے کھیل کے بارے میں دریافت کیا۔ ماں نے بتایا 'تم بچپن میں گولیاں بہت کھیلتے تھے'

اُسے یاد آیا اور مچان پر کارٹون پر گولیاں مل گئیں ۔ اُسے یقین ہو گیا لڑکی نے گولیاں ضرور دی ہوں گی۔

دوسرے دن وہ کپڑے کی تھوک منڈی گیا۔ وہاں اُسے پھر وہی لڑکی ملی ۔ عادل کے ساتھ اس نے بھی کپڑے پسند کئے۔

عادل نے کپڑے کا بنڈل ٹرانسپورٹ میں بک کرا دیا۔

عادل دوسرے دن سائیکل پر تجارت کے لئے نکل پڑا۔ راستے میں اُسے وہی لڑکی ملی۔ لڑکی نے کسی بڑے ہاٹ میں کپڑے فروخت کرنے کا مشورہ دیا۔ اور اس نے بتایا 'میں سبھی ہاٹ دیکھ چکی ہوں۔ چلو میں لے چلتی ہوں۔

عادل نے اس کی بات مان لی۔ لڑکی سائیکل پر آگے بیٹھ گئی۔ عادل سائیکل چلاتا رہا ۔ لڑکی راستہ بتاتی رہی۔ سائیکل تیز رفتار آگے کی جانب رواں تھی۔ وہ ہاٹ پہنچ چکا تھا۔

لڑکی نے جگہ کا انتخاب کیا۔ اُسی جگہ پر عادل نے دکان لگا دی ۔ لڑکی ساتھ رہی ۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اُسے دیکھتے ہی لوگ دکان پر آنے لگے۔ کوئی بھی دکان پر آتا کچھ خرید کر ہی جاتا ۔ لڑکی اپنی دلکش اداؤں سے گاہک کا دل جیت رہی تھی ۔ اس کی آواز بڑی سُریلی' پیاری اور کوئیل جیسی میٹھی تھی ۔ وہ ہنستی مسکراتی گاہکوں کو کپڑے دکھاتی ۔ اس کی

مسکراتی اداؤں نے گاہکوں کا دل جیت لیا تھا۔

لڑکی روز الگ الگ بازاروں میں ہاٹوں میں لے جاتی۔اس طرح عادل کو تجارت سے اچھا خاصہ منافع ہونے لگا۔

ایک شام عادل کام سے جلدی فارغ ہو چکا تھا۔لڑکی سے باہر ملنے کا وعدہ تھا۔وہ باہر گیا لڑکی سے ملاقات ہوئی۔

وہ عادل کو لے کر سیر و تفریح کے لئے گئی۔عادل اس لڑکی کے ساتھ چلا۔وہ آگے آگے چل رہی تھی۔وہ اُسے لے کر پھولوں کے باغ میں پہنچی۔اتنے حسین اور خوبصورت باغ میں اس سے پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا۔وہ باغ ایک ہنستا مسکراتا سنسار تھا۔جہاں رنگ برنگے پھول تھے۔پھولوں کی کیاریاں سجی تھیں۔کلیوں کے کھلتے پھول اتنے دلکش تھے کہ دیکھتے دیکھتے دل باغ باغ ہو جائے۔

طرح طرح کی خوشبو سے پوری فضا معطر تھی۔

دونوں باغ میں بیٹھ گئے۔کسی موضوع پر بات کرتے رہے۔

یکا یک لڑکی سنجیدہ ہو گئی۔"کبھی کبھی ڈرتی ہوں عادل اپنے اکیلے پن سے"

عادل بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا کیا جواب دے۔اس نے لڑکی کو تسلی دی۔

لڑکی نے پہلی بار اُسے اپنا نام بتایا...... "نکہت۔"

وقت زیادہ ہو چکا تھا۔پھر دونوں وہاں سے چل پڑے۔

عادل کے پاس تجارت کے لئے کپڑا نہیں تھا۔وہ کپڑے کی منڈی گیا۔اس دفعہ لڑکی

منڈی نہیں آئی تھی ۔ کپڑے خود عادل نے پسند کئے ۔ اور کپڑوں کا بنڈل ٹرانسپورٹ کے حوالے کیا۔

دوسرے دن بنڈل عادل کونہیں ملا۔ اورلوگوں کا سامان پہنچ چکا تھا۔ٹرانسپورٹ کے اس دفتر کوفون کیا' جہاں سے بنڈل بک کرایا تھا وہاں سے معلوم ہوا سارے بنڈلس بھیجد یئے گئے ۔ جس ٹرک سے مال آیا تھا۔ اس ٹرک سے صرف اس کا بنڈل غائب ہوا تھا۔

نکہت کی طبیعت ناساز تھی' اس وجہ سے وہ عادل سے نہیں مل سکی تھی ۔ اب وہ عادل سے ملنے جا رہی ہے ...... سڑکوں کے منہ کھلے ہیں ...... اس کے قدم آگے کی جانب رواں ہیں ...... وہ سوچ رہی ہے ...... اس طرح روز روز عادل کے ساتھ رہنا ٹھیک نہیں ...... بات زیادہ دبی نہیں رہ سکتی ...... آج نہیں تو کل کوئی نہ کوئی اس بات کو اٹھائیگا ...... پھر لوگ میرا مذاق اُڑائیں گے ...... میں بدنام ہو جاؤں گی ...... میرا جینا اجیرن ہو جائے گا ...... میں بے سہارا لڑکی ہوں ...... تو پھر ...... میں عادل سے کہوں گی ...... میرا اس طرح روز روز آنا مناسب نہیں ...... میں عادل سے معذرت کی درخواست کروں گی۔

لیکن سوچتے سوچتے نکہت کے دل میں ایک طوفان اُٹھا ہے ۔ عجب طوفان ہے یہ ...... اس کا دل بے قابو ہو رہا ہے ...... وہ سمجھنے سے قاصر ہے ...... آخر اس کے دل کی ایسی حالت کیوں؟

وہ عادل سے دور ہونا چاہتی ہے ...... مگر دل اجازت نہیں دیتا ...... ایسا کیوں؟

اس کی اندرونی حالت دیوانہ پن سی ہے ...... کہیں کہیں ...... وہ عادل سے محبت ...... عجب بے قراری ہے ...... اس کا دل کہہ اٹھتا ہے ...... ہاں ...... ہاں ...... یہی محبت ہے

۔میں عادل سے محبت کرنے لگی ہوں۔اب اس کا دل زور زور سے کہہ رہا ہے...... محبت تو قدرت کی دین ہے......دو دلوں کا ملن ہے...... محبت ہیر کی رانجھا سے......شیریں کی فرہاد سے......لیلیٰ کی مجنوں سے......سوہنی کی مہیوال سے ہوئی...... کہیں اس کی محبت یکطرفہ تو نہیں...... یہ خیال آتے ہی وہ سہم گئی ہے۔پھر وہ دعاؤں کے شجرا گانے لگی...... اللہ پاک تو رحیم و کریم ہے......تجھ سے کچھ چھپا نہیں......سب کے دلوں کی حالت جانتا ہے......تو چاہے تو خوشیوں کی برسات کر دے یا غموں کا طوفان اٹھا دے......

میرے پروردگار عادل کے دل میں میرے لئے محبت پیدا کر دے......وہ خیال کے رتھ پر سوار چلی آرہی تھی کہ اس کی نگاہ یکا یک پریشان عادل پر پڑی......

اس نے دیکھا عادل پریشان حال بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔وہ عادل سے ملی۔عادل نے سب کچھ بتایا۔دونوں ساتھ ساتھ پولس اسٹیشن گئے۔

پولس نے ٹرانسپورٹ دفتر سے تحقیقات شروع کی۔ڈرائیور اور خلاصی سے دریافت کیا گیا۔معلوم ہوا وہاں سے دس کلومیٹر دور ایک مقام پر رات ٹرک خراب ہو گئی تھی۔خلاصی میکینک لانے اور ڈرائیور روٹی کا انتظام کرنے چلا گیا تھا۔پولس اس گاؤں کے قرب و جوار میں' بدنام زمانہ لوگ کے گھر گھر چھاپا مارا۔آخر کار پولس نے کپڑے کا بنڈل برآمد کر لیا۔

عادل کپڑے کا بنڈل لے کر اپنے گھر آ گیا۔نکہت بھی اُس کے ساتھ تھی۔دوپہر کا وقت تھا۔عادل کے گھر والے آرام کر رہے تھے۔وہ کپڑے اپنے حساب سے ملا کر رکھنے لگا نکہت بھی اس کی مدد کرتی رہی......عادل جب کپڑے ترتیب سے رکھ چکا' تقریباً آدھے گھنٹے بعد نکہت چلی گئی۔

دوسرے دن عادل کپڑے لے کر ہاٹ گیا۔لیکن نکہت نہیں آئی۔

عادل جب تک ہاٹ میں رہا' بے چین رہا۔اس کا دل دکانداری میں بالکل نہیں لگ رہا تھا۔شام ہوگئی تھی۔سب اپنی اپنی دکانیں سمیٹ رہے تھے۔وہ بھی سمیٹنے لگا۔

عادل سائیکل پر اپنے گھر کی جانب رواں ہے۔نکہت کے بارے میں سوچ رہا ہے......

آج کیوں نہیں آئی...... کیا وجہ ہے......وہ جتنا سوچ رہا ہے......اتنی ہی بے چینی بڑھتی جا رہی ہے...... چلتے چلتے اپنے زندگی کے کتابوں سے ماضی کے اوراق پلٹ رہا ہے......اس اوراق میں نکہت رقص کر رہی ہے......بچپن کے سارے منظر تھرکتے نظر آتے ہیں......بچپن میں لڑکی نے کھیلنے کے لئے گولیاں دی تھیں......وہ اس کا انتظار کرتا......وہ بار بار انتظار کرتا ......کیوں......وہ نہیں آئی تو اس کی تصویر دل میں آہستہ آہستہ دھندلی ہوگئی......اور وہ تصویر پھر غائب ہوگئی۔

لیکن کافی عرصہ بعد جب سن بلوغت کی منزلیں طے کرتے ہوئے ایک دن دوپہر کے وقت عادل کپڑے فروخت کرنے جا رہا تھا......اچانک وہ لڑکی ملی ......پھر ملتی ہی رہی ......ساتھ ساتھ بازار جاتی' کیوں......؟وہ سوچ کے دریا میں بہتا جا رہا ہے......پھر اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا ہے......وہ دل کی آواز سننے کی کوشش کر رہا ہے......دل اس سے کہہ رہا ہے ......تم نکہت کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتے......مگر نکہت ......پتہ نہیں نکہت کے دل میں کیا ہے......جتنا سوچ رہا ہے......اتنا ہی الجھتا جا رہا ہے......پھر بھی وہ سوچ رہا ہے......غور کر رہا ہے......اپنی فکر وفہم سے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے......وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے......نکہت میری جان ہے......میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا......شاید قدرت نے نکہت کو

میرے لئے بنایا ہے......اسی لئے تو قدرت نے بچپن میں ہی ملا دیا تھا......اور پھر جوانی میں بھی ملایا......دلوں میں محبت پیدا کی ......میں نکہت سے محبت کرنے لگا ہوں ......محبت عبادت ہے......ہاں، محبت سچی عبادت ہے......ایسی عبادت جو دیوانہ بنا دیتی ہے......یعنی محبت دیوانہ پن ہے......میں بھی نکہت کا دیوانہ ہو گیا ہوں ......محبت کے کتنے ہی قصے مشہور ہے......محبت کی نہیں جاتی ......خود بخود ہو جاتی ہے ......محبت تو رومیو کی جولیٹ سے ......شاہجہاں کی ممتاز سے ہوئی......اسی محبت کی یادگار عمارت آگرہ کا تاج محل ہے......جسے شاہجہاں نے ممتاز کے لئے بنوایا تھا......اور قدرت نے نکہت کو میرے لئے بنایا ہے ......اب اس کا دل پوچھ رہا ہے......شاہجہاں نے اپنی محبت کی یادگار تاج محل تعمیر کرائی تھی ......تم اپنی محبت کے لئے کیا کرو گے شاہجہاں تو ایک عظیم شہنشاہ تھا......عظیم ہندوستان کا شہنشاہ......اس کے پاس دولت تھی......اسی لئے اس نے اپنی محبت کی یادگار تاریخ کے صفحہ ہستی میں تاج محل ایک عجوبہ پیش کیا......جو دنیا کے عجوبوں میں سے ایک ہے......میں ایک عام انسان ہوں......نکہت کے لئے اپنا گھر سجاؤں گا......اس کی ہر ممکن آرزو پوری کروں گا ......اس کی زندگی میں خوشیوں کی بہار لاؤں گا......اپنے آشیانہ میں ہنستا مسکراتا چھوٹا سا سنسار بساؤں گا۔

عادل پہلی بار دل کے ساگر میں غوطہ زن ہے......پھر اُسے محسوس ہوا......محبت کے جذبے ساگر کی لہروں کی مانند اس کے وجود میں مچل رہے ہیں۔ اُسے لگا، نکہت آ گئی ہے ......وہ اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے چکا ہے......وہ اسے لے جا رہا ہے......دور بہت دور......تنہائیوں میں......جہاں ایک دوسرے میں سما جائیں......اور گھنٹوں تنہائیوں

کی مچلتی فضاؤں میں محبت کے ساز پر رقص کرتے ہوئے سب کچھ بھول جائیں...... اچانک اس کی آنکھوں پر تیز روشنی پڑی...... کوئی گاڑی سامنے جھٹکے سے رُکی ہے...... سائیکل ٹکراتے ٹکراتے بچی ہے...... عادل اپنے گھر آ گیا ہے۔

عادل گھر سے نکل پڑا ہے...... دیوانہ وار...... دیوانہ وار اس کے قدم نکہت کے گھر کی جانب رواں ہیں...... وہ سوچتا جا رہا ہے...... نکہت سے اپنی محبت کا اظہار کروں گا...... شاید وہ بھی اظہار کرنا چاہتی ہوگی...... شرماتی ہوگی...... یا ڈرتی ہوگی...... وہ خیالوں کے رتھ پر سوار تیز تیز چل رہا ہے...... راستے میں ٹھوکریں کھا رہا ہے...... سنبھل رہا ہے...... پھر دیوانہ وار چلنے لگا نکہت کا گھر قریب آ گیا ہے۔

اچانک عادل ٹھٹھک کر رک گیا...... نکہت کے گھر سے کوئی سایہ نکلا ہے...... اس نے سایہ پہچاننے کی کوشش کی، مگر وہ دوسری جانب چلا گیا...... عادل کے دل پر بجلی گری ہے...... وہ سکتے میں آ گیا...... وہ واپس لوٹ گیا...... بوجھل قدموں سے گھر کی جانب رواں ہے...... وہ سوچ رہا ہے...... کون ہو سکتا ہے...... نکہت کے گھر سے نکلنے والا...... اس کا اپنا تو کوئی نہیں...... وہ تنہا رہتی ہے...... شاید وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے...... وہ مرد سایہ اُسی محبوب کا ہوگا...... وہ اندر سے ٹوٹ رہا ہے...... بکھر رہا ہے...... پھیکی مُسکان کے ساتھ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے گھر کی جانب رواں ہے۔

نکہت کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ وہ زخمی ہو گئی تھی۔ نکہت کے گھر سے نکلنے والا سایہ ایک نیک صفت انسان، اس کے پڑوس کے منہ بولے چچا رحمت کی تھی۔ ڈاکٹر کے یہاں سے مرہم پٹی کرانے کے بعد گھر چھوڑنے آئے تھے اور اس کی تیمارداری کے بعد اپنے گھر چلے

گئے تھے۔

نکہت اکیلی گھر میں پڑی ہے......اُسے پڑوس کا ہی کوئی بتانے آیا ہے......جس کی ملازمت کرتی تھی......وہ آیا تھا......اور رحمت چچا کو باہر نکلتے دیکھ کے واپس لوٹ گیا ہے......

نکہت سوچ کے کھنڈر میں بھٹک رہی ہے......عادل کیوں لوٹ گیا......کیا اُسے میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں......کیا وہ شک کا شکار ہو گیا ہے......کیا وہ مجھ سے محبت کرتا ہے......شاید، تبھی تو وہ میرے گھر سے کسی کا نکلنا برداشت نہیں کر سکا......پھر......عادل کے دل سے شک دور کرنا ہوگا......ایک امتحان سے گزرنا ہوگا......سیتا بھی اگنی پریکشا سے گزری تھی......کیا مجھے بھی کچھ ایسا ہی......پہلے میں رحمت چچا سے خبر بھیجوں گی......اس کے بعد کچھ سوچوں گی۔

رات کے وقت عادل بستر پر ہے۔وہ بہت پریشان ہے......سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے نہا چکی ہیں......پھر کب نیند کا غلبہ طاری ہوا......اُسے پتا نہیں......صبح کے وقت اس کا چہرہ زرد پڑا تھا......

کوئی عادل سے ملنے آیا ہے......وہ رحمت چچا ہیں......انہوں نے نکہت کے حادثے کی اطلاع دی، پھر سارا واقعہ اپنے واپس جانے تک کا سُنا دیا......

عادل اپنے شک اور بیوقوفی پر شرم سار ہے......اس کے دل میں خوشیوں کا طوفان پھر آ گیا ہے......وہ نکہت کے گھر کے جانب رواں ہے......اب اس کے قدموں میں تیزی ہے۔

عادل سامنے کھڑا ہے...... عادل کو دیکھ کر نکہت کی آنکھیں خوشیوں کی بارش کر رہی ہیں

...... وہ زخمی حالت میں ہونے کے باوجود اٹھ گئی ہے...... اب وہ کھڑی ہو چکی ہے...... اس

کے قدم لڑکھڑا رہے ہیں...... عادل نے آگے بڑھ کے اُسے سنبھال لیا ہے......

محبت کا جذبہ دلوں میں ہلچل پیدا کر چکا ہے...... دونوں نے ہونٹوں کو جنبش دی ہے......

اپنی اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔ محبت تو ایک مقدس اور عظیم جذبہ ہے......

اب دونوں کے جذبوں میں ٹھہراؤ آ گیا ہے اور ان کے محبت بھرے جذبوں میں

جھلسانے والی آگ کے بھڑکتے شعلے نہیں...... عادل کے پیار اور جذبوں کے ٹھہراؤ نے نکہت

کے حسین وجود کو بے حد حسین بنا دیا اور عادل کا پیار پا کر اس نے قلبی تسکین محسوس کی

...... نکہت نے بھی عادل پر اپنا بھرپور پیار نچھاور کیا اور پھر دونوں کی زندگی میں ہنستا مسکراتا

طوفان آ گیا۔

اک لاش آپ کی منتظر ھے

(گجرات حادثہ پر مبنی)

قارئین،

یہ کہانی مختلف ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کہانی کو لکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اور قارئیں یقین کیجئے، دراصل میں نے یہ کہانی لکھی ہی نہیں۔ ایک صبح نیند سے آنکھ کھلی تو تین چیزیں، جاگنے کے ردّعمل کے طور پر میرے سامنے تھیں۔

ایک لہو آگیں صبح، آسمان سرخ سرخ دھبوں کی کہانیاں پیش کرر ہا تھا۔

دوم:۔ خون میں لپٹا ہوا اخبار جو یقیناً گودرہ اور گجرات کے سفر سے ہوتا ہوا میرے ہاتھ میں تھا۔

سوئم:۔ یہ کہانی، جو لکھی ہوئی میرے ہاتھ میں جھول رہی تھی۔

قارئین، اس کہانی کی تاریخ پیدائش وہی ہے، جو گودرہ کے المناک حادثے کی ہے۔ گجرات کے زخموں کی ہے۔ تو یہ کہانی آپ ہی آپ انہی دنوں لکھ دی گئی جب گجرات جل رہا تھا۔ اور گجرات کے شعلے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے، اپنی گرمی سے یہاں دلی کے ۴۲ ڈگری ٹیمپریچر کو 100 ڈگری پر پہنچانے کی کوشش کرر ہے تھے۔ یعنی سوچتے سوچتے آپ بھسم ہو جائیں۔ سواہا ہو جائیں یا پھر پنچ تو میں لین ہو جائیں۔

تو بے حد پیارے قارئین! ایسے ہی 100 ڈگری ٹیمپریچر میں جھلتے ہوئے اس کہانی نے اپنے بادبان کھول دیئے۔

ملک کی تقسیم کے دنوں میں جب انسان حیوان بن گیا تھا اور جب مذہبی جنون لہو کا دریا بن کر بہہ نکلا تو سابرمتی آشرم والے یعنی اسی گجرات کے باپو نے پورے ملک کو امن و آشتی کا پیغام دیا تھا

یہ ریاست ہندوستانیت کا گہوارہ ہے۔

اس ریاست میں بسنے والوں نے دل کھول کر پیار باٹنا ہے اور پیار پایا ہے۔ ہمیں آزاد ہوئے چون سال گزر چکے ہیں۔ لیکن یہاں ہر فرقے ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کرتے آئے تھے۔ اور سبھی تہوار جنم اشٹمی، عید، گرو پرب اور کرسمس وغیرہ مل کر منایا۔ اس دھرتی پر ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی نہیں بلکہ انسان بستے تھے۔ جن کا مذہب انسانیت تھا۔ مگر یہاں کچھ مہینوں سے بدامنی کے سرکنڈے سر ابھارنے لگے اور سیاسی غوطہ خوروں نے سیاست کے سمندر سے ذاتی مقاصد کے موتی چننے کی خاطر غوطے لگانے شروع کر دیے، موتی ہاتھ نہ لگے تو انہوں نے پتھر چن لئے۔ اس طرح سیاسی غوطہ خوروں کا دل بھی پتھر جیسا ہو گیا۔

اور چنے ہوئے پتھروں کو ریاست کے مختلف حصوں میں پھیلا دیا اور یہی پتھر فرقہ پرستی کا جنون بن گیا۔ پھر...... ریاست فرقہ پرستی کی آگ میں جلنے لگی اور ہزاروں موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ لاشوں کا ڈھیر لگ گئے۔ ان لاشوں میں ایک لاش ایسی بھی تھی جس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ لاش کے جسم کا درمیانی حصہ کچلا جا چکا تھا۔ یہ شناخت کرنا ممکن نہیں تھا کہ لاش ہندو کی ہے یا مسلمان کی۔

''ہندو کی ہے'' ایک ڈاکٹر آہستہ سے بولا۔ ''دیکھتے نہیں، چہرے پر کیسی شانتی ہے۔ اوم شانتی اوم۔''

''نہیں مسلمان کی ہے۔'' دوسرا ہاؤس سرجن گویا ہوا۔ ''دراصل یہ اپنی بدقسمتی پر مسکرا رہا ہے۔ سر، باپو کے دیس میں پیدا ہونے کی بدقسمتی کے نام پر۔''

دیکھتے ہی دیکھتے وہ لاش گفتگو کا مرکز بن گئی تھی۔ لیکن وہ لاش کہاں کیسے برآمد ہوئی، چلئے ہم آپ کو اس کی تفصیل میں لے چلتے ہیں۔

(۳)

تو یہ باپو کے سپنوں کا شہر تھا۔ اور کچھ دنوں سے لگاتار اس شہر میں تیزاب کی بارش ہو رہی تھی۔ یعنی چند نئے چہرے کچھ دنوں سے اس شہر میں دیکھے جا رہے تھے۔ وہ چہرے سے خوفناک اور فسادی لگتے تھے۔ اجنبی چہرے سیتا رام، نیپالی سنگھ اور ببر میاں کے تھے۔

ریاست کے مختلف حصوں میں فساد کے باوجود شہروں میں امن و چین تھا۔ لیکن اس شہر میں جب سے سیتا رام نیپالی اور ببر میاں جیسے اجنبی چہرے نظر آئے تھے تب سے چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔

شہر میں امن و چین کے باوجود اچانک ایک رات کسی ہندو پر قاتلانہ حملہ ہوا۔

دوسرے دن سیتا رام نے شہر کے ہندوؤں کو اکٹھا کیا اور ولولہ انگیز تقریر کی اور اس تقریر نے ہندوؤں کے جذبوں میں الفاظ کے شعلے بھر دیئے اس طرح ہندو پوری طرح سیتا رام کے نرغے میں آ چکے تھے۔

تیسری رات ایک مسلمان بچہ زخمی حالت میں بے ہوش پایا گیا۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں

ہونے لگیں۔ ببّر میاں مسلمانوں کو بھڑکانے لگا۔اس نے مسلمانوں کو یکجا کر کے اور کچھ ایسا زہر فضا میں اپنے منہ سے اگلا کہ ببّر میں کے نرغے میں سارے مسلمان آ گئے۔اور بچہ زخمی حالت میں ملنے سے ببّر میاں نے اس موضوع کو اتنا طول دیا کہ یہ ایک طوفان بن گیا۔فساد ی طوفان' آہستہ آہستہ یہ طوفان بھیانک ہوتا گیا۔ جس شہر میں انسان بستے تھے،وہ شہر فرقہ پرستوں اور مذہبوں میں قید ہو گیا تھا اور جو انسان فرقوں اور مذہبوں میں تقسیم ہو گئے وہ بری طرح تنگ نظری کے شکار ہو گئے۔

شہر میں دونوں فرقوں کے کتنے ہی عاقل اور تجربہ کار بزرگ تھے۔ دونوں فرقوں کے بزرگوں نے مل کر صلاح و مشورہ کیا۔آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچے ان کے شہر میں سازش رچی جا رہی ہے اور اس کے سربراہ اجنبی چہرے ہیں۔

شہر میں دونوں فرقوں کے بزرگوں نے اپنے اپنے طریقے سے لوگوں کو سمجھانا چاہا،مگر ان اجنبی چہرے کی سازش کے آگے سب بے سود ہو گیا۔اس طرح سیتا رام، نیپالی سنگھ اور ببّر میاں کی سازشوں نے شہر میں تناؤ پیدا کر دیا۔

شہر جہاں کبھی لوگوں میں بھائی چارہ تھا۔پیار و محبت تھا۔اب یہ بارود کے ڈھیر پر ہے ۔دیکھتے دیکھتے فرقہ پرستی کا جنون سر چڑھ کر بولنے لگا۔

گلی کوچوں میں عورتیں دوسرے فرقے کی عورتوں سے نہیں ملتی تھیں۔وہ اپنے اپنے فرقے والیوں سے ملتی تھیں۔یعنی ہر کام میں اپنے فرقے کو ترجیح دی جاتی۔اور اس طرح بدگمانیاں بڑھنے لگیں۔

پہلے تو صرف چہ میگوئیاں تھیں۔سر چڑھتی بولیاں تھیں۔پھر چہ میگوئیاں اور بولیاں بات

بن گئیں ۔ پھر یہی بات بارود بن گئی اور پھر یہی بارود ایک دن شعلے بن گئے ۔

اس شعلے نے دونوں فرقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

وسیم اور راجیش کی دکان آمنے سامنے تھی ۔ دونوں دوست تھے سیتا رام اور ببّر میاں کی وجہ سے اب ان دونوں میں ذرا بھی نہیں بنتی تھی ۔ دونوں ایکدوسرے کے دشمن بن گئے تھے ۔ وسیم کا ساتھ دے رہا تھا ببّر میاں اور راجیش کا ساتھ سیتا رام دے رہا تھا۔

نیپالی ایک نمبر کا مکاّر فریبی تھا جو انگریزوں جیسی پھوٹ ڈالو کی حکمت عملی سے لوگوں کے دلوں میں نفرت ہی نفرت پیدا کر رہا تھا۔

شہر میں پوری طرح بدامنی کی فضا ہو جائے ،اس کے لئے سیتا رام ،نیپالی اور ببّر میاں جیسے سماج دشمن عناصر کوشاں تھے۔ آخر کار وہ لوگ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو ہی گئے ۔

سیتا رام مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے دلوں میں پوری نفرت پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ اس ہندو پر قاتلانہ حملہ مسلمانوں نے کیا ہے ۔ ہمیں خاموش نہیں رہنا چاہئے ۔ اس طرح سیتا رام نے کتنی ہی گمراہ کن باتوں سے دلوں میں بے حساب نفرت پیدا کر دی ۔ چند نوجوان طیش میں آ کر سیتا رام کو اپنا رہنما تسلیم کر لیا۔ اور پھر طے ہوا کہ ہندوؤں کا جلوس نکالا جائے ۔

ببّر میاں بھی ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کے دلوں میں پوری طرح نفرت پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے کہ...... ’’اس بچہ کو ہندوؤں نے زخمی کیا ہے ۔ ہمیں خاموش نہیں رہنا چاہئے ۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ہوگا ۔ ہندوؤں کو سبق سکھانا ہوگا ۔‘‘ آخر کار ببر میاں نے بھی مسلمانوں کو جلوس نکالنے پر آمادہ کر لیا۔

ہندو تنظیم کی قیادت سیتارام کر رہا تھا اور مسلم تنظیم کی قیادت ببر میاں۔

ہندو تنظیم کا جلوس شہر کے مغربی گوشے سے نکالا جا رہا تھا اور مسلم تنظیم کا جلوس شہر کے جنوبی گوشے سے نکالا گیا۔ دونوں جلوس کی مڈ بھیڑ کا وقت قریب تھا۔ جلوس میں شہر کے نوجوانوں کے علاوہ اور بھی کئی اجنبی چہرے شامل تھے۔ اب جلوس شہر کے ایک چوراہے پر آمنے سامنے ہے۔ اچانک سیتارام نے ہر ہر مہادیو اور درگا ماتا کی جئے، کا نعرہ بلند کیا۔ جلوس میں اجنبی چہرے والے نے بڑے جوش وخروش سے اسی نعرے کو دوہرایا ہے۔ اس جلوس میں شامل شہری نوجوانوں نے بھی نعرہ بلند کیا ہے۔

پوری فضا میں نعرے کی آوازیں گونج رہی ہیں۔

جواب میں ببر میاں نے ''نعرۂ تکبیر'' کی آواز فضا میں بلند کی۔ اس جلوس میں شامل اجنبی چہرے والے نے بڑے جوش سے 'اللہ اکبر' کی آواز بلند کی۔ جلوس میں شامل لوگوں نے بھی یہی نعرہ بلند کیا ہے۔ پوری فضا نعروں سے گونج رہی ہیں۔ دیکھتے دیکھتے جلوس پر کنکڑیوں کی، پھر پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ پھر پتھر بموں میں تبدیل ہو گئے۔ بموں کی گڑگڑاہٹ سے پوری فضا لرزنے لگی۔ پھر گولیوں کی آوازیں بھی فضا میں گونجنے لگیں۔ پھر شہر کے اندرون اور باہری حصوں میں بھی جگہ جگہ دھوئیں اٹھنے لگے اور یہی دھواں پھر شعلوں میں بدل گیا۔ ہر طرف شور اور قیامت کا منظر ہے...... جب تک پولیس حالات پر قابو پاتی تب تک پورا شہر فسادی شعلوں کی نذر ہو چکا تھا۔ سڑکوں پر خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ ہزاروں بے قصور اس فساد کی نذر ہو چکے تھے۔ کتنی ماؤں نے اپنا لخت جگر کھو دیا تھا۔ کتنی ہی عورتوں کی زندگیوں میں تاریکی راج کرنے لگی تھی۔

پولیس حالات پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے۔ چاروں طرف خوف و ہراس کا ماحول ہے۔ کشیدگی برقرار ہے۔

کرفیو میں نرمی برتی جا رہی ہے۔ اب لوگوں کو اپنے اہل وعیال کی فکر ہے۔ سب اپنے اپنے کنبے کی تلاش میں لگے ہیں۔ اب کوئی اجنبی چہرہ نظر نہیں آرہا ہے۔ سیتارام، نیپالی اور نہ ہی ببّر میاں۔

دونوں فرقوں کے بزرگوں نے لوگوں کا دھیان مرکوز کیا کہ سیتارام کہاں ہے؟ نیپالی کہاں ہے؟ ببّر میاں کہاں ہیں......؟

شہر کے کئی لوگوں نے ان تینوں کو تلاش کیا اور وہ نہیں ملے۔ تب دونوں فرقوں کے بزرگوں نے کہا۔ ''میں پہلے ہی کہتا تھا۔ ان لوگوں کے دام میں نہیں آؤ۔ مگر تم لوگوں نے ایک نہ سنی اور ہزاروں بے قصور مارے گئے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں۔ وہ اجنبی کوئی بھی ہو سکتے ہیں جیسے سیاسی مہرے۔'' بزرگوں کی باتوں کا اثر لوگوں پر ہوا۔ اب لوگوں کے دلوں میں خوف و ہراس کم ہو رہا ہے۔ وہ اپنے اپنے کنبے کی تلاش میں نکل پڑے ہیں۔

ہسپتال میں عجب چیخ و پکار ہے۔ کسی کے بازو کٹے ہوئے ہیں۔ کسی کے پیر کٹے ہیں۔ جسم جگہ جگہ سے زخمی ہے۔ ان میں کتنے ہی جوان بوڑھے عورتیں اور بچے شامل ہیں۔ یہی منظر شہر میں کئی کیمپوں میں ہے۔ ہسپتال میں جگہ نہیں رہنے کی وجہ سے کیمپ لگائے گئے ہیں۔

جوق در جوق لوگ ہسپتال میں موجود ہیں۔ یہاں شور اور قیامت کا منظر ہے۔ بزرگوں کی باتوں کا اثر جادو سا ہوا ہے۔ تناؤ کی شدت کے تار ٹوٹنے لگے اور لمحے کا سکوت جب

کرچی کرچی ہوکر بکھر گیا تو جنون اور نفرت کا طوفان تھم گیا۔ اور وہاں پر ہندو مسلم فرقوں سے وابستہ لوگ اب انسان بن چکے ہیں۔ زخمیوں کو خون کی ضرورت ہے۔ زخمیوں کو خون دینے کے لئے کتنی ہی آوازیں اور کتنے ہی ہاتھ بلند ہو گئے ہیں۔ یہ آوازیں اور یہ ہاتھ فرقوں کے نہیں انسان کے ہیں۔

بھیڑ کو چیرتا ہوا ایک نوجوان غلام نبی سامنے آ گیا ہے۔ اور اس کے پیچھے پیچھے کئی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جو ہر فرقوں سے منسلک ہیں انسان کی شکل میں آ گئے ہیں۔

سبھی ایکساتھ کہہ اٹھے ہیں، ''یہ زخمی سب انسان ہیں، ہمارے بھائی بہن ہیں۔ میرے جسم سے خون کی ہر بوند لے لو ڈاکٹر میرے بھائی ،بہنوں کی زندگیاں بچالو ڈاکٹر...... میرے بھائی بہنوں کی زندگیاں بچالو......''

اس طرح کی آوازیں ابھرتی ہی چلی جارہی ہیں۔ یہ آوازیں ہیں۔ غلام نبی' پیٹر' دلیش مکھ' روپا، عابدہ اور کتنے ہی لوگوں کی......

ڈاکٹر نے انہیں بلڈ گروپ ٹیسٹ کے لئے بھیج دیا ہے۔

کچھ ہی لمحوں میں بلڈ گروپ ٹیسٹ ہو گیا ہے۔ اب جس کا خون ،جس زخمی سے میچ کر رہا ہے۔ انہیں خون دیا جارہا ہے۔ ان رگوں میں بہنے والے خون کا رنگ صرف سرخ ہے۔ یہ خون کسی فرقے کا نہیں انسان کا ہے۔

اپنے اہل وعیال کی تلاش میں لوگ ہسپتال آئے ہیں۔ جن کے رشتہ دار ہسپتال میں مل گئے ہیں۔ وہ وہیں رک گئے ہیں اور ان کی تیمارداری میں لگ گئے ہیں۔ بہت سارے لوگ اب بھی لاپتہ ہیں۔ ان کے رشتہ دار ہسپتال اور کیمپوں میں تلاش کرتے ہوئے مردہ گھر پہنچ

چکے ہیں ۔ بھیڑ اکٹھی ہوگئی ہے ۔لوگوں کو قطار میں اندر جانے کی اجازت دے دی گئی ہے۔جن لوگوں کو اپنا کوئی نظر آیا اس نے شناخت کی ہے، پولس نے ،لاش شناخت کرنے والے کے حوالے کر دی ہے۔

اب سینکڑوں لاشیں ایسی پڑی ہیں ،جس کا کوئی وارث نہیں۔ لاوارث لاشوں میں عورت کی لاش ایک بھی نہیں ہے۔

اب ہندو مسلم تنظیم لاوارث لاشوں کے لئے آ گئی ہے۔ پولس لاشوں کا معائنہ کر رہی ہے۔ ہندو لاش الگ کر رہی ہے اور مسلم لاش بھی الگ کر رہی ہے۔

ہندو لاش ، ہندو تنظیم کو کریا کرم کے لئے دی جا رہی ہے۔

مسلم لاش، مسلم تنظیم کو تدفین کے لئے حوالے کی جا رہی ہے۔

صرف مرد کی ایک لاش ہے۔جس کے لئے پولس فیصلہ نہیں کر پا رہی ہے۔ یہ لاش ہندو کی ہے یا مسلمان کی ...... اس لاش کا سینے کے نیچے کا سارا عضو بری طرح کچلا ہوا تھا۔لیکن اس لاش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے ...... ایک خفیف مسکراہٹ ...... پولس والے فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں، آخر یہ لاش کس تنظیم کے حوالے کی جائے ۔اسے کریا کرم یا تدفین کے لئے دی جائے۔

آپ چاہیں تو گجرات کے کسی بھی ہسپتال میں اس لاش کے بارے میں انکوائری کر سکتے ہیں۔ وہ لاش آج بھی شناخت کے لئے آپ سب کی منتظر ہے۔کیا آپ اس لاش کی شناخت کر پائیں گے......؟

باہر نکلو خواب سے

کبھی اس کی زندگی میں خوشیوں بارش ہوتی تھی......

دولت، شہرت سب کچھ میسّر تھے......اُس کی زندگی ایک حسین خواب کے مانند تھی......

اُس حسین خواب نے اُسے کس مقام پر پہنچایا تھا......

دولت......شہرت......کامیابی......اور پھر زوال۔

وہ خوابوں کی چھت سے گر کر لہولہان ہو چکا تھا۔

سب کچھ کھو کر وہ لوٹ آیا تھا......اپنی نیلو کے لئے......بیٹا ثاقب کیلئے......

وہ بوجھل قدموں سے گھر میں داخل ہوا......چاروں طرف نظریں دوڑائیں......مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

اچانک وہ چیخ پڑا ۔

نیلو——

ثاقب——

کہاں ہو تم لوگ——دیکھو میں واپس آ گیا ہوں——

میں واپس آ گیا ہوں——

آواز گونجتی رہی——

جواب ندارد۔

اُس کی آنکھیں آنسوؤں کی بارش کر رہی تھیں......

اُس کی دنیا ویران ہو چکی تھی......

اپنی دنیا اُس نے خود ویران کی تھی......زندگی کی ساری خوشیاں تو تھیں اُس کے پاس......

حرص وطمع کی اُڑان میں وہ اُڑتا گیا......اس اُڑان میں اُس نے بہت کچھ حاصل کیا تھا......

کبھی نیلو نے ٹوکا تھا......اتنی لمبی اُڑان ٹھیک نہیں......

دوستوں نے کہا تھا......کیا کمی ہے......بس لوٹ آؤ......زیادہ لالچ ٹھیک نہیں ارشد......گھر گرہستی سنبھالو۔

مگر اس کے قدم آگے کی جانب رواں رہے۔

وہ دولت کی ہوس میں کچھ اور ہی بن گیا تھا۔

گھوڑا......تیز گھوڑا......دوڑتا ہوا گھوڑا......اُڑنے والا گھوڑا......

گھوڑا اُڑ رہا تھا......

اُڑتے ہوئے گھوڑے کی لگام کوئی تھام نہیں سکا......

گھوڑا اور بھی اُڑنا چاہتا تھا۔

یہاں تک......یہاں تک......نہیں بہت دور......چاند تک......پورے آسمان میں......

گھوڑے نے کبھی پیچھے کی جانب مڑ کر نہیں دیکھا......

وہ خوابوں کی دنیا میں سیر کر رہا تھا......

☆☆

گھوڑا ریل سے بھی تیز اڑ رہا تھا...... غالباً ہوائی جہاز جتنا تب وہ نوٹ چھاپنے والی مشین بن گیا تھا......

فیکٹری تھی ......کلب تھے ......سوسائٹی تھی ......پارٹیاں تھیں ......جوئے کی میز تھی ......جام تھے......جلوے تھے......

اور گھر میں ......نیلو اور ثاقب اس کے منتظر رہتے ......لیکن اُسے نیلو کی ......ثاقب کی ......فکر ہی کہاں تھی......

نیلو کو اُس کا شوہر ارشد چاہئے تھا......

اور ثاقب کو ڈیڈی......

وہ کب گھر آتا اور کب چلا جاتا' ان دونوں کو پتہ ہی کہاں ہوتا......دونوں دل برداشتہ تھے......

☆☆

کلب میں مونا......

حسین مونا......

اور ارشد......

ارشد' مونا کے جال میں الجھا تھا۔

دولت کے نشے میں چور......بیوی بچے سے دور......اپنی ایک الگ کائنات بسائی تھی

اُس نے......

اُس کائنات میں خوشیوں کی رم جھم تھی......

جام تھے...... جلوے تھے...... نخرے تھے...... نغمے تھے...... اور بھی بہت کچھ...... یعنی ایک حسین کائنات تھی یہ...... ایک حسین دنیا......

وہ تو سپنوں کا سوداگر بن چکا تھا۔

اور سپنوں کے سوداگر پر...... جیسے سپنوں کی چھت سے نوٹوں کی بارش ہو رہی تھی......

بارش مسلسل ہو رہی تھی...... مگر بارش کے بعد کے بارے میں کس نے سوچا تھا۔

بارش کے بعد...... مستقبل کے دریچے میں کون جھانکتا ہے۔

وہ نہ ماضی میں جانا چاہتا تھا، نہ مستقبل میں۔

بس، حال، کی رنگین چوکھٹ تھی اور گھوڑا تھا......

☆☆

گھوڑا لہولہان پڑا تھا......

سچ کھو گیا تھا......

نہیں، سچ واپس مل گیا تھا۔ مونا سچ نہیں تھی۔ مونا سچ کا، کہیں سے بھی حصہ نہیں تھی۔

مونا سراب تھی۔ -illusion-

اور...... گھوڑا لہولہان پڑا تھا۔

نہیں، گھوڑے نے دم توڑ دیا تھا......

وہ دبے پاؤں گھر میں داخل ہوا...... گھر میں اتنی تاریکی کیوں ہے۔

سب کہاں چلے گئے۔ کہاں کھو گئے۔ اُس نے آواز دینا چاہا۔۔ ثاقب'

نیلو—

آواز لوٹ آئی۔

ثاقب—

آواز تھرّا کر رہ گئی۔

نیلو......

سب کہاں گم ہو گئے......

وہ آگے بڑھا۔ بستر' چادر' کواڑ' دروازے' اور گھر...... سب کچھ اتنا بدل کیوں گیا ہے۔

اُس نے اپنے خاص کمرے میں' بیڈروم میں اتنے اندر اُترے اندھیرے کو محسوس کیا۔

بتی جلائی...... پھر سہم گیا۔ دیواروں پر' گھر کی' کسی موقع پر لی گئی تصویریں فریم کی

شکل میں آویزاں تھیں...... وہ اچانک اُن تصویروں پر جھک گیا۔

اس میں ثاقب بھی تھا۔ نیلو بھی۔ ثاقب کو اُس نے گودی میں بھر رکھا تھا۔

نیلو کی بانہیں اُس کے کمر کے اردگرد کسی ہوئی تھی۔ دونوں اتنے قریب تھے......

اتنے قریب...... اور مسکراتا ہوا شرارتی ثاقب......

اس کی آنکھوں میں کہیں سے' بہتی ہوئی گنگا کی موج آخر چپ لگا گئی تھی۔

اُس نے آنکھوں کو خشک کیا۔

دوبارہ تصویروں کی جانب دیکھا۔

اور ایکدم سے چونک گیا۔

دیوار پر فریم اب بھی آویزاں تھی۔ مگر تصویر۔

تصویر غائب تھی......

وہ پھر ٹھہرا نہیں۔ چپکے سے آکر بستر پر لیٹ گیا۔

روشنی کو جلتا چھوڑ دیا۔

کچھ خواب آنکھوں میں آکر ٹھہر گئے تھے......

کیمپ میں بچہ

لوگوں کا سمندر......!

شاید آپ چونک گئے ہوں کے لوگوں کا سمندر کیا ہے......؟

اب آپ کو جاننے کی جستجو ہو رہی ہو گی' کیسا سمندر ہے......لیکن ٹھریئے......آپ پریشان کیوں ہو رہے ہیں......دل کو قابو میں رکھئے......تبھی تو آپ اس سمندر کی گہرائی میں غوطہ زن ہو سکتے ہیں......ورنہ آپ غرقاب ہو جائیں گے......ہاں تو میں لوگوں کے سمندر کے بارے میں بتانے جا رہا ہوں......آپ اپنے دل کو مضبوط کر لیجئے اور سنئے......کبھی اُس ریاست کے گاؤں محلے قصبے اور شہروں میں جو لوگ رہتے تھے۔ اب وہ ویران پڑے ہیں اور اکثر لوگ فساد زردگان پناہ گزین کیمپ میں جھلس رہے ہیں......یہاں ذرا بھی جگہ نہیں......جیسے لوگوں کا سمندر......جدھر دیکھو لوگ ہی لوگ......چیخ پکار کا ماحول......روتے بلکتے بچے......بے بس عورتیں......بھوک اور پیاس کی شدت سے خشک ہونٹ......بیمار لوگ......زچگی و دیگر پریشان کن حالات......اُف یہ کیا ہو گیا......انسان ہی انسان کا دشمن بن گیا......!

اُس سمندر میں ایک چہرہ ایسا بھی ہے جو بے بس اور بے حرکت ہے۔ یہ ایک عورت کا چہرہ ہے......اچانک وہ چونک جاتی ہے' جیسے اُسے کچھ یاد آیا ہے۔ وہ کھڑی ہو جاتی ہے اور پورے کیمپ میں بھاگ بھاگ کر ثمینہ ثمینہ آواز لگانے لگتی ہے......

مگر ،اس سمندر کے عذاب بھرے ماحول میں کیسے درد والم کی داستان سننے کی فرصت کہاں؟ آخر کار وہ بے حس سی بیٹھ جاتی ہے اور ایک پھیکی مسکان اس کے ہونٹوں پر رینگ جاتی ہے جیسے وہ اپنی روٹھی قسمت کا مذاق اڑا رہی ہو۔ پھر وہ سپنوں کے رتھ پر سوار ہو جاتی ہے ــــاس کی آنکھوں میں ثمینہ کے بچپن کا منظر تیرنے لگتا ہے۔ تب گھر میں خوشیاں رقص کرتی تھیں...... خوش اخلاق شوہر...... ننھی پیاری ثمینہ...... دولت شہرت کے ساتھ ضروری آسائش کی چیزیں اور ایک ہنستا، مسکراتا سنسار ــــ جب شریف میاں یعنی ثمینہ کے ابو گھر آتے تو ثمینہ انہیں پریشان کرنے کے لئے گھر کے کسی گوشے میں چھپ جاتی اور اس کے ابو کافی پریشان ہونے کے بعد تلاش کر لیتے اور پھر گھر میں ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑتا۔

"شرارت کرتی ہے...... آئیں...... چھپ کر میری آدھی جان نکال دیتی ہے......"

"مدھے اتھا لگتا ہے۔" ثمینہ توتلی زبان میں کہتی۔

"لیکن ابو کو اتنا پریشان کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا......" ریحانہ کہتی۔

"میری بیٹی کو کچھ مت کہو...... سنا تم نے...... کچھ نہیں کہنا...... نہیں تو"...... شریف میاں بولے۔

"نہیں تو، کیا...... تمہارے اسی لاڈ پیار نے اسے بگاڑ رکھا ہے۔" ریحانہ بولی

"یہی تو میں چاہتا ہوں۔ جس گھر میں بچے کا کھیل نہیں تو وہ گھر کیسا؟"

اچانک ریحانہ کو لرزش و لغزش کا احساس ہوتا ہے اور وہ سپنوں کے چھت سے گر پڑتی ہے...... اس کی آنکھیں آنسوؤں کی بارش کرنے لگتی ہیں...... وہ لوگوں کے سمندر کو دیکھتی ہے...... اور چاروں طرف نظریں دوڑاتی ہے...... اسے ثمینہ کی یاد آتی ہے...... وہ تو ثمینہ کے ساتھ نکلی تھی جو راستے میں بچھڑ گئی ...... اور پھر ثمینہ...... ثمینہ ...... میری بیٹی ثمینہ' کہہ کر کیمپ میں ہر جانب آواز لگاتی ہے۔ ......

لیکن کیمپ میں ثمینہ کہیں نہیں ہے...... وہ لوگ سے، عورتوں سے، بچوں سے پاگلوں جیسی دیوانہ وار پوچھتی ہے...... کسی نے میری ثمینہ کو دیکھا ہے...... وہ ثمینہ کا قد اور حلیہ بھی بتاتی ہے...... لیکن کوئی بھی کچھ بتانے سے قاصر ہے۔ تھک کر وہ خاموش بیٹھ جاتی ہے۔ اس کے ذہن میں وہ واقعہ جی اُٹھتا ہے...... جس واقعے نے اُسے اس سمندر میں پہنچادیا ہے...... کتنے سکون سے وہ اپنے گھر میں رہ رہی تھی، ساتھ میں بیٹی ثمینہ تھی۔ اچانک گودھرا حادثہ کے بعد شہر اور تقریباً پوری ریاست کی فضا میں کشیدگی بڑھتی گئی۔

پھر خبریں ملیں، کئی شہروں میں سماج دشمن عناصر نے فساد کا ڈنکا بجا دیا ہے۔ پوری ریاست میں فسادی شعلے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ سڑکیں خون سے نہا رہی ہیں۔ گوشت پوست کا جسم مر رہا ہے۔ ہزاروں لوگ فساد کی نذر ہو رہے ہیں۔ کتنی ماؤں کی گود سونی ہو چکی ہیں۔ کتنے بچے یتیم ہو گئے ہیں۔ کتنی عورتیں بیوہ ہو چکی ہیں۔ موت کا تانڈو جاری ہے...... اب فسادی شعلے لپکتے ہوئے اُس علاقے میں بھی آچکے ہیں جہاں ریحانہ بی بی اپنی بیٹی ثمینہ کے ساتھ رہتی ہے۔ لوگ محفوظ جگہ کی تلاش میں ہیں...... کسی پر اعتبار نہیں...... کسی پر بھروسا نہیں...... فساد کا ہیرو مذہب بن چکا ہے اور ریحانہ بھی اپنی بیٹی ثمینہ کے ساتھ اپنے گھر سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر جانے کا ارادہ کر رہی ہے۔

ریحانہ انہیں خیالوں میں تھیں کہ دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ دروازے پر بھرت بھائی شاہ کھڑے تھے...... ریحانہ بھرت بھائی شاہ کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی ہے۔ بھرت بھائی شاہ کہتے ہیں...... بھابھی جی، ہم لوگ ہمیشہ ساتھ رہتے آئے ہیں۔ ہر ہر موقع پر پرب تہواروں میں مل کر خوشی اور پیار بانٹا ہے۔ ثمینہ کے ابا شریف بھائی نیک خیال تھے۔ اُن کا

کہنا تھا مذہب دشمنی نہیں سکھاتا۔ ہم ان کے خیالوں سے اتفاق کرتے ہیں۔ اس لئے آپ یہاں سے کہیں نہیں جائیں گی۔ ہم سب مل کر رہیں گے۔ آپ سب کی حفاظت کریں گے ......

بھرت بھائی کی شاہ کی باتوں سے ریحانہ کو تسلی ہوئی ہے ...... وہ گھر چھوڑ کر جانے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے ...... لیکن بیٹی ثمینہ اب بھی خوفزدہ ہے۔ وہ اپنی ماں سے کہتی ہے یہ لوگ چاروں طرف سے پورے علاقے پر قابض ہیں۔ اگر خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو ہم مٹھی بھر لوگ کیا کر پائیں گے ...... بہتر ہے کسی محفوظ مقام پر چلیں ...... بیٹی کی بات سُن کر ماں اُسے تسلی دیتی ہے ......

رات کا وقت ہے ...... ریحانہ سو چکی ہے ...... مگر ثمینہ کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور ہے ۔اچانک اُسے دور کی آواز سنائی دیتی ہے ...... جیسے بجرنگ بلی کی جے' نعرہ تکبیر اللہ اکبر' درگا ماتا کی جے ...... اس آواز سے وہ چونک کر بیٹھ جاتی ہے ...... پھر اُٹھتی ہے ...... سیڑھیوں سے ہوتی ہوئی چھت پر آتی ہے تو' دور کا منظر دیکھ کر وہ کانپ جاتی ہے ...... گھروں سے آگ کے شعلے اُٹھ رہے ہیں ...... بموں کی آوازیں گونج رہی ہیں ...... گولیوں کی آوازیں آرہی ہیں ...... مشتعل ہجوم کی آوازیں قریب آتی جا رہی ہیں ...... اور ثمینہ دوڑ کر اپنی ماں ریحانہ کے پاس آتی ہے ...... اُسے جھنجھوڑ کر جگاتی ہے ...... اس نے جو کچھ دیکھا ماں کو بتاتی ہے ...... بجرنگ بلی کا نعرہ لگاتے ہوئے ہجوم قریب آچکا ہے ...... آوازیں اور بھی قریب آتی جا رہی ہیں ...... اب ریحانہ کی سوچنے سمجھنے کی قوت ختم ہو چکی ہے ...... ہجوم ہزاروں کی تعداد میں ہے ...... ریحانہ کو سمجھتے دیر نہیں لگی یہ باہری حملہ آور ہیں ...... یہ چند لوگ مشتعل ہجوم روک

نہیں سکتے ...... اور ریحانہ اپنی بیٹی ثمینہ کے ساتھ پچھلے دروازے سے نکل پڑیں ...... اور بھی لوگ اُدھر سے بھاگ رہے ہیں ...... اسی درمیان پتہ نہیں کب اور کیسے ثمینہ کا ساتھ چھوٹ گیا تھا —

اور ریحانہ پھر چیخ اٹھتی ہے — ثمینہ ...... ثمینہ — ایسے کئی لوگ ہیں جنہیں اپنے لوگوں کی تلاش ہے ...... وہ نام لے لے کر پکار رہے ہیں ...... مگر ......؟

ثمینہ کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ ریحانہ اپنی بیٹی کا حُلیہ بتا بتا کر تھک چکی ہے اور بے جان سی ایک جگہ بیٹھ گئی ہے ...... اب وہ اپنی بیٹی کے لئے دعاؤں کا شجرا گا رہی ہے ...... اللہ میری بیٹی کو محفوظ رکھیو ...... اپنی امان میں رکھیو ......

اب ریحانہ خیالوں کے رتھ پر سوار ہوگئی ہے۔ کیا یہ باپو کا دیس ہے ...... باپو کی ریاست ہے ...... وہ باپو جو امن اور آشتی کا پیغام دیتے تھے۔ جو فرقہ واریت کے سخت خلاف تھے ...... جنہوں نے امن کے بل پر ہندستان آزاد کرایا تھا ...... کیا یہ وہی ہندستان ہے ...... جہاں انسان انسان کا دشمن بنا ہوا ہے ...... مذہب کا فسادی جنون اپنے گھر سے دور کر رہا ہے ...... اپنے ملک کو اپنا نہیں کہہ سکتے ...... یہ ہماری کیسی آزادی ہے ...... ہم یہ کیسی آزادی کا جشن مناتے ہیں ...... جیسے لاشوں کے ڈھیر پر کھڑے ہیں ...... لاش کا خیال ذہن میں آتے ہی ریحانہ پھر خیالوں سے بیدار ہو جاتی ہے ...... اور پھر' ثمینہ ...... میری بیٹی ثمینہ ...... کہاں رہ گئی تم ...... ثمینہ — چیختی ہوئی کیمپ سے باہر آجاتی ہے ...... لیکن ثمینہ تو کہیں نہیں ہے۔

ریحانہ کو کتنی نفرت ہو رہی ہے اُن درندوں سے ...... جو ناری کی عزّت نہیں سمجھتے ...... جب کہ اُنہیں بھی جنم دینے والی' دودھ پلانے والی' پالنے والی' ماں' بہن' اور بیوی بھی ناری

ہوتی ہے۔

کیمپ سے تھوڑی دوری پر ریلوے لائن تھی۔علی الصباح ریلوے لائن کے کنارے ایک جوان لڑکی کی ننگی لاش پڑی تھی...... کیمپ میں شور ہوا...... لوگ دوڑے دوڑے وہاں پہنچے ہیں...... ریحانہ بھی وہاں پہنچ چکی ہے...... ننگی لڑکی کی لاش دیکھ کر وہ ساکت ہوگئی ہے...... لڑکی کی دونوں چھاتیوں پر خونی پنجوں کے نشان ہیں...... جیسے زدوکوب (عصمت دری) کے وقت دونوں چھاتیوں سے خوب کھیلا گیا ہے۔ ریحانہ اپنا دوپٹہ اُس لڑکی کی لاش پر اوڑھا دیتی ہے...... یہ ثمینہ کی نہیں کسی اورلڑکی کی لاش ہے...... اُس لڑکی میں اُسے ثمینہ کی جھلک نظر آتی ہے...... کیوں نہ آئے...... یہ بھی تو کسی کی بیٹی ہوگی جسے غنڈے بھیڑیوں نے اپنی ہوس کا شکار بنا کر ہمیشہ کی ابدی نیند سلا دیا تھا......

ریحانہ کو ثمینہ کی بہت یاد آرہی ہے۔ کتنی محبت سے اور کتنی پریشان کن حالات میں اپنے شوہر کے گزرنے کے بعد پالا تھا اُسے۔ یہی تو ایک نشانی تھی اس کے شوہر کی...... اور وہ بھی لمحہ بھر میں...... نہیں...... نہیں...... وہ زندہ ہوگی...... ضرور ملے گی____

اس کیمپ میں کئی حاملہ عورتیں بھی ہیں...... جن کی زچگی ہورہی ہے...... پاس ہی ایک عورت تڑپ اُٹھتی ہے...... اُسے شدّت کا درد ہورہا ہے۔کیمپ میں ڈاکٹر نہیں ہے۔ اس عورت کو زچگی کا درد ہے...... ریحانہ اُسے سہارا دیتی ہے۔ اُسے سہارا دیتی دیکھ اور بھی عورتیں آجاتی ہیں۔ ایک ساڑی اور دوپٹے کا پردہ کیا جاتا ہے۔عورت کی زچگی ہوتی ہے...... اور بھی کتنی حاملہ عورتیں ہیں اس کیمپ میں...... اور کتنی ہی عورتیں اور بچے ہیں جو بھوک سے بیزار ہیں...... ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں...... اُن میں چلنے پھرنے کی طاقت نہیں ہے۔

کتنے ہی چہرے زرد پڑ چکے ہیں...... کتنے کے چہرے سیاہ ہو چکے ہیں...... پھر بھی مائیں اپنے لختِ جگر کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں...... کتنے ہی معصوم بچے گود میں ہیں...... جو چند دنوں یا چند مہینوں کے ہیں...... انہیں ماں کا دودھ نصیب نہیں ہو پا رہا ہے۔ جن بچوں کی کلکاریاں گھر میں گونجتی تھیں۔ وہ بھوک اور پیاس کی شدّت سے بلک رہے ہیں...... رو رہے ہیں...... عجب شور ہے یہاں...... کتنے ہی بچوں کی آوازیں ہلکی پڑ گئی ہیں۔ پھر بھی مائیں اُسے اپنی چھاتی سے دودھ پلانے کی کوشش کر رہی ہیں...... مگر...... جہاں بھوک اور پیاس کا غلبہ ہو وہاں ماؤں کی چھاتی میں دودھ کہاں؟ بچے بھوک کی شدّت سے ماں کے سینے کو بھنبھوڑ رہے ہیں۔ شاید دودھ کا قطرہ نکل آئے اور ان کی بھوک مٹ جائے......

ریحانہ عورتوں اور بچوں کو دیکھ رہی ہے...... اس نے بھی تو ثمینہ کو اپنا دودھ پلایا ہے...... اور ثمینہ کا خیال آتے ہی وہ اپنی گود کی طرف دیکھتی ہے...... پھر اُسے یاد آتا ہے...... اُس کی ثمینہ تو جوان ہو چکی تھی اور اپنی اپنی حفاظت کے لئے محفوظ مقام کی تلاش میں گھر سے نکلے تھے...... جب ساتھ ساتھ تھی...... لوگوں کو جدھر موقع مل رہا تھا اُدھر ہی نکلے چلے جاتے تھے۔ پتہ نہیں کب اور کیسے ثمینہ بچھڑ گئی پھر؟

ریحانہ پھر ایک بار وہاں سے اُٹھتی ہے...... ثمینہ...... ثمینہ...... چیختی ہوئی کیمپ کے باہر آتی ہے...... مگر وہاں ثمینہ کہاں...... رات کا وقت ہے...... ریحانہ پریشان سی بیٹھی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک منظر تیرنے لگتا ہے...... جیسے ریلوے لائین کے کنارے اُس لڑکی کے جسم سے کھیل کر خونی بھیڑیوں نے اپنا منہ کالا کیا تھا...... کہیں اس کی ثمینہ کے ساتھ بھی...... ایسا خیال آتے ہی وہ کیمپ سے باہر نکل گئی ہے...... کیمپ کے محافظوں نے اُسے روکنے

کی ہر ممکن کوشش کی ...... محافظوں نے کہا، اتنی رات گئے کہیں جانا مناسب نہیں، ...... لیکن وہ نہیں مانی ...... وہ ریلوے لائین کی طرف بڑھ گئی ہے ...... وہ ریلوے لائین کی طرف بڑھتی جاتی ہے ...... گھپ اندھرا قدم چلنے کی طاقت سے محروم ...... دماغ گھوم رہا ہے ...... آوازیں، کیمپ کے ہنگامے، مصیبت زدوں کی کہانیاں، سب کچھ نگاہوں میں گھوم رہی ہیں ......

اور اچانک ......

اُسے ٹھوکر لگتی ہے ...... پتھر ہے ...... نہیں نالہ ...... نہیں پتھر ہے ...... کیچڑ ہے ...... پاؤں کیچڑ میں لت پت ...... وہ اُٹھنے کی کوشش کرتی ہے ...... اچانک ...... رونے کی، نومولود بچے کی چیخ کی آواز سن کر چونکتی ہے۔

پھر کوئی آواز تیزی سے شب خون مارتی ہے ...... بچہ ہوا ہے ...... بچہ ...... اس کے قدم ٹھہر گئے ہیں ......

بچہ ہوا ہے ......

کیمپ میں بچہ ہوا ہے ......

یعنی اس پر آشوب موسم میں ...... درد کی رات میں ...... پاگل کر دینے والی خاموشی میں ...... عذاب کا ماحول میں ...... اس کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ہے۔

کپڑے اور پاؤں کیچڑ میں لت پت ہیں۔ لیکن اُسے ذرا بھی پرواہ نہیں وہ مسکراتی ہوئی بچے کے تعاقب میں نکل کھڑی ہوئی ہے ......!

گود
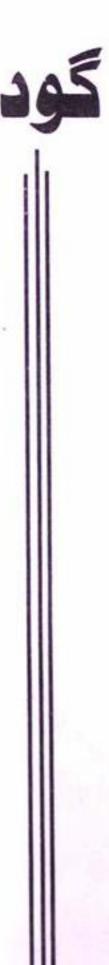
آنکھ کھلی تو جیسے دنیا ہی بدل گئی تھی...... نہیں، یہ اس کا وہم ہے...... دنیا نہیں بدلی ہے......

ہاں، وہ بدل گئی ہے...... زندگی سے کسی نے رنگ کھرچ دیئے تھے، ہرے، پیلے، لال، گلابی رنگ......

مینو۔اس نے آواز دینا چاہا۔

آواز لوٹ آئی۔

مینو...... مینو......

مینو...... کہاں ہو تم؟

لیکن مینو کہیں نہیں تھی۔

وہ جیسے خوابوں کے چھت سے گر کر لہولہان تھی...... مینو کہاں ہے کہاں کھو گئی مینو۔

اور...... آنکھ کھلی تو جیسے دنیا ہی بدل گئی تھی

☆☆☆

لیکن بدلی ہوئی دنیا میں کیا حاصل کیا تھا اس نے...... کیا گنوایا تھا۔

جو دنیا پیچھے چھوٹ گئی تھی، اس دنیا میں کیا کھویا تھا اس نے۔

وہ جیسے گھوڑے پر اڑ رہی تھی......

ملنے جلنے والوں نے ٹوکا...... اتنا تیز مت اڑو سروج۔

سہیلیوں نے اشارہ کیا...... ''پاگل مت بن۔''

آہستہ سے کہا گیا...... ''یہ سب ٹھیک نہیں ہے سروج۔''

مگر ٹھیک کیا تھا...... اور کیا ٹھیک نہیں تھا۔

جوان ہوتی ندیوں کا بہاؤ کس نے روکا ہے...... وہ بھی تو ایک ندی تھی۔ تیز بہتی ندی
...... رواں ندی...... پاگل آوارہ ندی...... لہروں کی طرح اچھلی، گرجی اور......

تب کلب تھے...... سوسائٹی تھی...... زندگی تھی اور ہوا میں اڑتے ہوئے گھوڑے تھے
۔ کانچ کے گلاس تھے اور گلاسوں میں......

ایک بار...... ایسا ہی ایک گلاس اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ پھر جیسے پارٹی یکا یک رک گئی تھی۔ تیز تیز چلتی سوئیاں ٹھہر گئیں...... گلاس گرتے گرتے، چھلک کر اس کے کپڑے بھگو گیا تھا......

کہاں تک......؟ نہیں۔ یہاں تک...... یہاں تک...... یہاں تک......

اس نے کپڑے اتار دیئے۔

زور کا قہقہہ گونجا۔

پھر جیسے کسی نے اس کے ہاتھوں میں اپنی گرفت سخت کر دی۔

''جسم میں اتنی بہاریں لے کر کہاں جاؤں گی۔''

''کیوں؟''

''میرے گھر کیوں نہیں آجاتی۔''

یہ سورج تھا...... آزاد خیال سورج۔

اور وہ گھوڑے کی طرح، اڑتی لہراتی کب سورج کے گھر آ گئی، پتہ بھی نہیں چلا۔

پتہ تو تب چلا......

جب زندگی کی شام ڈوب رہی تھی۔

اور گھنا اندھیرا آسمان پر چھانے لگا تھا۔

☆☆☆

شراب چھلک گئی تھی۔

وہ یکا یک جاگی...... جاگی تو جیسے اندر ہزاروں سانپ کلبلا رہے تھے۔

وہ یکا یک رات کے اندھیرے میں اٹھ بیٹھی...... سانس تیز تیز چل رہی تھی۔

بتی جلائی، اور پھر تیزی سے سورج کو جھنجھوڑنے لگی۔

سورج...... اٹھو اٹھو......''

سورج نے آنکھیں ملیں۔ گھبراہٹ اور پریشانی سے اسے دیکھا، پھر غصہ سے بولا۔

''کیا ہے''

''مجھے...... مجھے ماں بنا دو سورج...... ماں...... سچ...... میں ماں بننا چاہتی ہوں۔''

سورج نے اپنے جسم پر چادر تان لی...... صرف اتنا کہا......

''سو جاؤ...... تمہاری طبیعت اچھی نہیں ہے...... رات کافی ہو گئی ہے۔''

مگر رات کہاں تھی...... وہ تو جیسے گہرے سناٹے میں تھی۔

اور گھوڑے لگاتار آسمان میں اڑ رہے تھے۔

پھر جیسے ان گھوڑے نے آسمان میں اڑنا بند کر دیا...... گھوڑے کمرے میں اتر آئے

☆☆☆☆

وہ ایک بار پھر لہولہان تھی۔

وہ جھوٹ سے ''تتلی'' اور تتلی سے جھوٹ بن گئی۔

وہ کچھ اور بن گئی تھی۔ جسے پہچاننا آسان نہیں تھا۔ صرف خاموش رہ جاتا...... ہاں، ایک بار، ایک بار...... آہستہ سے اس نے سروج کو ٹوکا تھا۔

''سروج......''

''ہاں......''

''کل ایک اکیلی زندگی تھی؟''

''تو......؟''

''ہم نے ندی کی آوارہ گی ختم کر دی۔''

''تو......؟''

''ہم نے ندی پر باندھ بنالیا۔ ہم ایک ہو گئے۔''

اس کا غصہ ہر لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔

''ذرا سوچو سروج۔ کیا ہم اپنے آج کو سمجھ...... رہی ہونا اپنے آج کو بدل نہیں سکتے۔ یعنی جو کل تھا۔ وہ کل بیت چکا ہے۔ ایک ہنگامے میں کھویا ہوا کل...... پارٹیاں، کلب شراب اور زندگی......

اب اس زندگی کے رنگ جھڑنے سے بچالو...... you are finisded''

وہ زور سے چیخی تھی۔ ''تمھارے پاس سے اڈونچر ختم ہو رہا ہے تو میرا کیا قصور...... مجھ سے بندھے نہیں ہو تم۔ ندی کمزور باندھ کو توڑ بھی سکتی ہے۔''

سورج ڈر گیا تھا۔

ندی ایک بار پھر کھلکھلائی' گرجی اور تیز لہروں کے ساتھ مچلتی رہی۔ لیکن اچانک ...... بالکل اچانک......

خالی گود میں ایک ماں آ گئی تھی۔ ماں میں ایک خالی گود اتر آئی تھی۔

یا ایک خالی گود میں...... یا ماں میں...... کمرے کے پر اسرار سناٹے نے تیزی سے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔

''تم پر رحم آتا ہے۔''

''کیوں؟''

''چہ چہ چہ......''

''تھک جاؤ گی تو...... وہاں دیکھو...... وہاں گھوڑے سسک رہے ہیں۔''

اس نے پیٹ کے پاس ہاتھ پھیرا...... ارے ہاں سچ میں سسکیوں کی آوازیں تھیں۔ اور کراہتی ہوئی خاموشی......

کمرے نے چپکے سے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

تمہاری گود خالی ہے۔ اور بس خالی رہے گی۔ ماں بن جاتی تو مکمل ہو جاتی۔

پھر جیسے کچھ دیر بعد اسے سناٹے کی کھلکھلاہٹ سنائی دی۔

☆☆☆

''اوہ......کہاں ہوتم۔ نامکمل عورت......''

وہ ڈر گئی تھی۔

سروج بری طرح ڈر گئی تھی......

رات کے اندھیرے میں، سورج کے بے حس پڑے ہاتھوں سے کھیلتے ہوئے اس نے دھیرے سے کہاں۔ ''سورج۔''

اندھرے میں سورج کی آواز ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''کیا ہے......'' ''سورج سنوتو......رات......کمرہ......سناٹا......گود......''

وہ ڈری ڈری سی لگ رہی تھی......

''سوجاؤ سروج......رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے......صبح باتیں کریں گے۔''

سورج نے ایک لمحے کو اس کی طرف دیکھا۔ بتی جلائی۔ اس کے چہرے پر فیصلے کی گہرائی تھی۔

☆☆☆

سروج خوش تھی۔

اس کا اکیلا پن دور ہو چکا تھا۔

سروج نے مینو کو گود لے لیا تھا۔

مینو سروج کی گود میں کھیل رہی تھی۔

اب وہ کتنی بدل گئی تھی۔

کبھی وہ جھوٹ سے ''تتلی'' اور تتلی سے جھوٹ تھی۔ مگر اب......اب وہ ماں تھی......ممتا

نچھاور کرنے والی ماں...... وہ شانت تھی...... ایک شانت ندی...... کیوں کہ ندی پر مضبوط باندھ بن چکا تھا......

مینو کا خیال سروج امید سے کہیں زیادہ رکھتی تھی۔

☆☆☆

مینو بڑی ہو چکی تھی۔

وہ اسکول جانے لگی تھی۔

مینو کی وجہ سے گھر ہنستا مسکراتا سنسار بن چکا تھا۔

لیکن اچانک......

سروج کا ہنستا مسکراتا سنسار اجڑ گیا۔ جیسے اس سنسار کو کسی کی نظر لگ گئی۔

اس کی مینو گم ہو چکی تھی۔

مینو کی ہر ممکن تلاش کی گئی......

مگر مینو نہیں ملی۔

وہ جیسے خوابوں کی چھت سے گر کر لہولہان تھی......

''مینو...... اس نے آواز لگائی۔''

''مینو...... مینو...... مینو...... کہاں ہو تم......؟ مینو''

سروج آواز لگا لگا کر تھک چکی تھی۔

مینو کہیں نہیں تھی۔

سروج کی گود گم ہو چکی تھی۔

اس نے اپنی گود کی طرف نگاہیں دوڑائیں اور......

مینو......مینو......چیختی ہوئی' جنونی حالت میں لڑکھڑاتے قدموں سے چلتی ہوئی بیٹی کے تعاقب میں نکل کھڑی ہوئی۔

نیازمانہ

رشتوں کی ڈور بھی کتنی نازک ہوتی ہے۔ باپ‘ ماں‘ بھائی‘ بہن‘ بیٹی‘ بیوی‘ شوہر‘ دادا اور دادی وغیرہ سبھی تو رشتوں کی ڈور میں بندھے ہیں۔ چاہتوں کی ڈور ایک دوسرے کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ گھر میں خوشیوں کی لہریں‘ امیری‘ غریبی‘ مجبوری اور بے بسی سب کچھ دیکھنے کو ملتی ہے۔ تو آیئے اُن رشتوں کی ڈور میں بندھی ایک بیٹی کی کہانی سُناتا ہوں۔ بیٹی نے گزری زندگی میں کبھی بھی کوئی بے جا فرمائش نہیں کی تھی۔ مگر سن بلوغت میں بیٹی نے قدم رکھا تو بوریت محسوس کرنے لگی اور باپ سے ایک فرمائش کر بیٹھی۔ محترم قارئین‘ ایک بے حد معمولی سی فرمائش۔ اور آپ بہتر جانتے ہیں کہ ایک باپ دل کا کتنا حساس اور نازک ہوتا ہے۔ وہ بھی اپنی بیٹی کے لئے۔

بیٹی باپ سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ ماں سے نہیں‘ کیونکہ ماں اس پر حاوی تھی۔ ماں قدم قدم پر بیٹی کو ٹوکا کرتی جیسے یہ ٹھیک نہیں‘ وہ ٹھیک نہیں‘ ایسے مت بیٹھو‘ ایسے مت بولو‘ ایسے کپڑے مت پہنو‘ ایسے فیشن مت کرو وغیرہ وغیرہ۔ اور بیٹی ماں کو دیکھتے ہی خوف سے تھرا اٹھتی تھی۔ ماں کے برعکس بیٹی باپ کو اپنا دوست سمجھتی تھی‘ مگر باپ کو اتنی فرصت کہاں تھی...... وہ دن رات کولہو کے بیل جیسا اپنے کام میں مشغول رہتا اور جب کام سے فارغ ہو

کر گھر لوٹتا تو بیٹی سو چکی ہوتی۔

علی الصبح باپ نیند سے بیدار ہو کر' ضروری کاموں سے فارغ ہو کر' ناشتے کا انتظار کئے بغیر گھر سے باہر نکل جاتا اور دو ایک گھنٹے کام کر کے پھر ناشتہ کرنے واپس آتا تو بیٹی اسکول جا چکی ہوتی۔ باپ ناشتہ کرتا پھر کام پر جاتا۔ دوپہر میں باپ آدھے گھنٹے کی مہلت میں گھر آتا۔ تب بھی بیٹی اسکول میں ہی ہوتی۔ یہ سلسلہ برسوں چلتا رہا۔ چھٹی کے دنوں میں بھی باپ مشغول رہتا۔ کبھی راشن لانا' دیگر ضروریات کی چیزیں لانا' ڈاکٹر سے ملنا' بقایا وصولی کے تقاضہ پر نکلنا وغیرہ وغیرہ...... یعنی اتنے کام چھٹی کے دنوں میں بھی نکل آتے کہ پتہ ہی نہیں چلتا دن کیسے گزر گیا اور رات کیسے کٹ گئی...... بیٹی کو شاید ہی باپ سے بات کرنے کا موقع ملتا' وہ بھی چند سکنڈ یا منٹوں کے لئے۔ بیٹی اپنے دل کی باتیں قلیل وقت میں عیاں نہیں کر پاتی...... ماں کی نگاہیں' ہمیشہ بیٹی کا تعاقب کرتی رہیں۔ ماں جو زمانے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھ رہی تھی' زمانے میں پھیلتے مغربی روش کو دیکھ رہی تھی۔ بیٹی کو اس روش سے دور رکھنا چاہتی تھی...... بیٹی دسویں کا امتحان دے چکی ہے۔ نتیجہ عنقریب ہے۔ برسوں بعد باپ کو وہ دن میسر ہوا کہ وہ پورا دن اپنے گھر پر گزار سکے اور اچانک...... ہاں اچانک...... باپ بیٹی کو دیکھ کر چونک جاتا ہے...... بیٹی باپ کے پاس کھڑی ہو گئی...... اور باپ جیسے خواب سے بیدار ہوا——

بیٹی تو تاڑ جتنی لمبی ہو گئی تھی......

تاڑ ــــ!

لمبی ــــ!

باپ کے ذہن میں دونوں الفاظ سما گئے۔ وہ حیرت زدہ تھا...... تین سال پہلے بیٹی کتنی چھوٹی لگتی تھی۔ اس کے بعد باپ اس قدر مشغول رہا تھا کہ چھٹی والے دنوں میں پرب تہواروں میں، غرضیکہ کبھی بھی موقع نہیں مل پایا کہ بیٹی کی باتیں سنے اور اس کا جائزہ لے سکے

......اور تین سال میں ہی وہ کتنی لمبی ہوگئی......

بیٹی باپ کی آنکھوں میں جھانکتی ہے۔ باپ اندر سے خائف ہے...... باپ کو لگا، بیٹی کچھ کہنا چاہتی ہے...... وہ اُڑنا چاہتی ہے...... باپ اندر سے سہما سہما بیٹی کو دیکھ رہا ہے۔ اور سوچ کے سمندر میں غوطہ زن ہے کہ یہ وہی بیٹی ہے جسے چند سال پہلے اپنے سینے پر سلاتا تھا۔ اس سے کھیلتا تھا۔ اُسے لوریاں سناتا تھا۔ باپ خیالوں کے رتھ پر سوار ہے۔ ایک چھوٹی سی بچی، جسے آپ بیٹی مان لیجئے۔

رات کا وقت ہے۔ ایک کھپریل مکان کے ایک کمرے میں ڈھائی سالہ بیٹی باپ کے سینے پر ہے۔ ماں وہاں موجود نہیں ہے۔

باپ اُسے سلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُسے بہلا رہا ہے۔ پچکار رہا ہے۔ پیار کر رہا ہے۔ بیٹی کو لوریاں سنا رہا ہے۔

''چندا ماما دور کے، پوا پکایا گڑ کے

آپ کھایا تھالی میں، بیٹا رانی کو دیا پیالی میں

پیالی گئی ٹوٹ، بٹیا رانی گئی روٹھ''

بیٹی سو گئی ہے۔ باپ بیٹی کو سینے سے اُتارتا ہے. بچھاون پر سلاتا ہے۔ پھر خود سو جاتا ہے۔

آدھی رات کے وقت باپ اچانک جاگتا ہے۔ بیٹی کا بستر گیلا ہو چکا ہے۔ باپ بیٹی کی پینٹی بدلتا ہے۔ دوسرا بچھاون بچھا کر بیٹی کو سلاتا ہے اور پھر خود سو جاتا ہے۔

علی الصبح باپ اُٹھتا ہے۔ بیٹی سوئی ہوئی ہے۔ کچھ لمحوں کے بعد بیٹی کے رونے کی آواز باپ کے کانوں سے ٹکراتی ہے۔ باپ تڑپ اُٹھتا ہے۔ جلدی جلدی بیٹی کے پاس آتا ہے ۔ بیٹی کو گود لیتا ہے۔ اُسے چُپ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کچھ ہی لمحوں میں بیٹی چپ ہو جاتی ہے۔

باپ کو بیٹی کا گندہ پھلیا اور اس کے کپڑے دھونے میں ایک عجیب خوشی محسوس ہوتی تھی ۔ یہ سلسلہ ہفتوں چلتا رہا۔

ماں بیمار تھی ۔ باپ، ماں کو مائیکے پہنچانے گیا تھا۔ آرام کے لئے، آب وہوا بدلنے کے لئے ...... باپ جب وہاں سے واپس لوٹنے لگا تو بیٹی نے گھیر لیا۔ بہت کوششوں کے باوجود بھی بیٹی نے باپ کا پیچھا نہیں چھوڑا تو اُسے اپنے ساتھ لے آیا اور ہفتوں پریشانیاں اٹھانی پڑیں ...... باپ کام پر نہیں جا پا رہا تھا اور لاچار ہو کر باپ نے بیٹی کو پھر ماں کے پاس پہنچا دیا تھا ...... باپ خیالوں سے بیدار ہو چکا ہے۔ اُسے لگا، یہ باتیں تو کل ہی کی ہیں ۔ تو پھر، اتنی

لمبی...... تار جتنی لمبی ہوگئی...... وقت کتنی تیزی سے گذرا۔ احساس بھی نہیں ہو پایا۔ اچانک باپ پھر چونکتا ہے...... بیٹی تو وہیں کھڑی ہے۔

شاید کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی ہے......

''...... پاپا۔''

''—— کیا بات ہے بیٹا۔''

''...... گھر میں دل نہیں لگتا۔ بور ہوتی رہتی ہوں......'' بیٹی دونوں جملے ایک ساتھ کہہ دیتی ہے۔

''—— تو پھر۔''

''...... ایک ٹی وی لا دیجئے نا۔''

بیٹی کی بات سے باپ کو احساس ہوا شاید وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ گھر میں دل بہلانے کے لئے تو کوئی شغل ہونا چاہئے۔ نہ گھر میں کھیلنے کا سامان ہے اور نہ دل بہلانے کے لئے ٹی وی ' ریڈیو یا ٹیپ وغیرہ۔ ایسا کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں۔ آخر بچے کیسے دل بہلائیں گے...... باپ اڑوس پڑوس میں اپنے بچوں کو جانے سے روکتا ہے۔ پڑوس کا ماحول ٹھیک نہیں۔ اپنے بچوں کو پڑوس کے بچوں کے ساتھ رکھا جائے تو ان کا مستقبل روشن ہونے کے بجائے تاریک ہوگا۔ بچے گالیاں سیکھیں گے۔ باپ جاہل سماج میں مجبوراً رہ رہا ہے۔ مالی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ مکان کرایہ کا بوجھ اتنا ہے کہ وہ بھی بڑی مشکل سے ادا کر پاتا ہے...... اور

تعلیم یافتہ سماج میں کرائے پر لینے کی استطاعت نہیں......تو پھر بچے دل کہاں بہلایا کریں ...... بیٹی، باپ سے ٹھیک ہی کہہ رہی ہے— 'ایک ٹی وی' لا دیجیے— ''

باپ کا ذہن دل کی آوازوں کے گرد گھومتا ہے۔

''لیکن کیسے—؟''

''ٹی وی مفت میں تو آتا نہیں— ''

''ٹی وی کے لئے ہزاروں روپے چاہئیں......''

باپ فکرمند ہو جاتا ہے۔ بیٹی کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کے چہرے کا جائزہ لیتا ہے۔ پھر —

بیٹی کو تسلی دیتا ہے۔ بیٹی چلی جاتی ہے۔

لیکن باپ نے بیٹی کے چہرے پر لکھی عبارت کو پڑھ لیا ہے، بیٹی تو کچھ اور ہی چاہتی ہے۔ شاید......شاید وہ زمانے کے ساتھ اُڑنا چاہتی ہے......

زمانہ کے ساتھ اُڑنا......

کیا یہ ممکن ہے......؟

کیا بیٹی کو زمانے کے ساتھ اڑنے دیا جائے......؟

اب باپ کو وہ دن یاد آ رہا ہے۔ جب بیٹی اپنی پسند کا کپڑا اماں کے ساتھ خرید لائی تھی۔ بیٹی خود درزی کے یہاں گئی تھی۔ بیٹی نے اپنی پسند سے کپڑے کا گلا بڑا رکھا تھا تو ماں، بیٹی پر

برس پڑی تھی۔ ماں بیٹی کو کسی بھی حال میں مغربیروش کی اجازت نہیں دے سکتی تھی......

تو پھر باپ......!

باپ بیٹی کی ایسی خواہشوں کی تکمیل کردے؟ باپ کے ذہن میں طرح طرح کے ایسے کئی سوالات اُبھر رہے ہیں......اور ماں کی نگاہیں تعاقب کر رہی ہیں——

باپ الجھنوں کے بھنور میں ہے۔ اور اپنے بچوں کی خوشیوں کے لئے دعاؤں کے شجر اُگا رہا ہے......رات کا وقت ہے۔ باپ بستر پر لیٹا ہے۔ اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور ہے۔ وہ الجھنوں کے بھنور میں الجھتا جا رہا ہے۔ سوچ کی دریا میں بہہ رہا ہے۔ بیٹی تاڑ جتنی لمبی ہو گئی ہے......اس کی شادی کی بات چل رہی ہے......اپنی شادی کی بات سن کر بیٹی کا چہرا سرخ ہو گیا ہے۔ وہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی ہے......باپ کو لگا، جیسے گھر میں رونق ہی رونق ہے۔ گھر بجلی کے قمقموں سے سجا ہوا ہے۔ مہمان گھر میں بھرے ہوئے ہیں۔ سہیلیاں رنجیتا اور شبو وغیرہ بیٹی کو چھیڑ رہی ہیں۔

بارات آگئی ہے۔ دولہا گھوڑے پر سوار ہے۔ پھر کچھ ہی لمحوں بعد دولہا اور دلہن شادی کے ازدواجی بندھن میں بندھ گئے ہیں۔

بیٹی کی رخصتی کا وقت آگیا ہے۔ اب بیٹی بابل کا گھر چھوڑ کر اپنے پیا کے دیس جانے والی ہے۔ اور باپ چونک کر بستر پر اُٹھ بیٹھا......یہ تو محض ایک خواب ہے......فرط جذبات میں باپ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں اور یہ آنسو آنکھوں سے باہر بہہ نکلے......

بیٹی تو پرائی امانت ہے۔ بچپن سے جوانی تک باپ کے گھر۔ اور جوانی شوہر کے گھر۔ پتہ نہیں اُسے کیسا گھر نصیب ہو...... باپ اپنی آنکھیں خشک کرتا ہے۔ پھر بستر پر لیٹ جاتا ہے ۔ ذہن بیٹی کی باتوں میں الجھا ہوا ہے۔ باپ پھر خیالوں کے رتھ پر سوار ہو گیا ہے۔ اب باپ بیٹی کی خوشیاں لانے جا رہا ہے ٹی وی گھر میں آ گیا ہے...... بیٹی کے چہرے پر خوشیاں رقص کر رہی ہیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے...... وہ چلبلی ہو رہی ہے...... گویا دنیا کی ساری خوشیاں اس کی مٹھیوں میں سما گئی ہیں...... باپ پھر خیالوں سے بیدار ہوا اور وہ پورے گھر کا جائزہ لیتا ہے...... ٹی وی کہیں نہیں ہے...... گھر میں چاروں طرف خوفناک خاموشی کا تانڈو ہے...... باپ تلملا جاتا ہے...... اپنی بے بسی سے' اپنی مجبوری سے' جیسے غربت کی زندگی ایک عذاب ہے۔

صبح ہو گئی ہے۔ سب لوگ اٹھ چکے ہیں۔ اپنے اپنے کام میں مشغول ہیں۔ بیٹی ناشتہ لے کر آتی ہے۔ باپ کی آنکھیں بیٹی کی آنکھوں سے ٹکراتی ہے۔ باپ بیٹی کا چہرا دیکھتا ہے ۔ بیٹی ناشتہ کرنے کے لئے کہہ رہی ہے۔ باپ اب ناشتہ کر رہا ہے۔ بیٹی پاس کھڑی باپ کے چہرے کو دیکھ رہی ہے ۔ باپ اپنے چہرے کی پریشانیاں چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ وہ باپ کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھ رہی ہے۔ چہرے پر تھکن کے آثار ہیں ...... پھر بیٹی پوچھ لیتی ہے۔

—— پاپا آپ رات میں سوئے نہیں کیا......؟

باپ خاموشی سے ناشتہ کرتا رہا۔ بیٹی جاتی ہے اور چائے لے کر واپس آ جاتی ہے۔ تب تک باپ ناشتہ سے فارغ ہو چکا ہے۔ پھر چائے کی چسکیاں لینے لگا ہے۔ اُسی درمیان وہ کئی پہلوؤں سے سوچ کر اس نتیجے پر پہنچا ہے...... بیٹی نے زندگی میں کچھ مانگا نہیں۔ جیسا بھی مشرقی لباس دو پہن لیتی ہے۔ جو کھانے کے لئے دو کھا لیتی ہے...... ایک زمانے کے بعد سن بلوغت میں قدم رکھتے ہی، زمانے کی اُڑان کو دیکھتے ہی، اس میں ایک خواہش جاگی ہے۔ بوریت دور کرنے کے لئے گھر میں ٹی وی منگوانے کی خواہش...... باپ نے زندگی کی سترہ بہاریں بیٹی کو دیں۔ روکھی سوکھی بہاریں...... کیا باپ اپنی بیٹی کی خوشی کے لئے ایک ٹی وی بھی نہیں لا سکتا۔ ایسا خیال آتے ہی باپ گھر سے نکل پڑا ہے۔ اور وہ آہستہ آہستہ راہ چلتے خیالوں میں گم ہے کہ بیٹی نے باپ کے حصے کی خوشیاں اُن سترہ بہاروں کو سونپ دی ہیں۔ یعنی بیٹی تہذیب سے آراستہ ہے۔ تعلیم حاصل کر رہی ہے...... ہر طرح سے ماں باپ کا خیال رکھ رہی ہے...... باپ نے اُسے کیا دیا، ایک روکھا سوکھا پیار اس کی جھولی میں ڈالا ہے۔ باپ خیالوں کے رتھ پر سوار بڑھتا جا رہا ہے۔ چلتے چلتے اندر سے کوئی سرگوشی کرتا ہے اور باپ اس سرگوشی کا جواب دیتا ہے......

—— "اے بیوقوف، کہاں جا رہے ہو......؟

☆ ٹی وی لانے......

—— ٹی وی لانے

☆ ہاں۔

— کہاں سے لاؤ گے تم' تمہارے پاس اتنے پیسے کہاں ہیں۔

☆ پانچ سو روپے ہیں۔

— پانچ سو روپے — ؟ اندر کا آدمی تیز آواز سے ہنستا ہے...... کس یگ میں رہ رہے ہو تم فنتاسی اور جادوگروں کا زمانہ چلا گیا۔

☆ بکومت۔' بہت ساری اسکیمیں ہیں۔'

— لیکن تمہارے لئے نہیں...... ؟ اندر کا آدمی پھر ہنستا ہے۔ آخر مہینے کے یہ پانچ سو روپے بھی خرچ کر دیئے تو......'

☆ 'ہاں تو......ءءء' باپ رنجیدہ ہے'

— ٹی وی کے بعد بھی بیٹی کو بہت کچھ چاہیے۔

☆ ہاں وہ تو ہے۔'

— اور بیوی کو...... ؟ اندر کا ہنستا ہوا آدمی چپ ہو گیا ہے...... 'زیادہ خواب مت پالو۔ خواب بس سوتی آنکھوں میں ہی اچھے لگتے ہیں۔ گھر جاؤ۔ لیکن ہاں سنو...... بیٹی کی آنکھوں کا پہلا سپنا توڑ سکتے ہو......

☆ 'پہلا سپنا...... ؟'

— پاگل ہو۔ کوئی...... کوئی اس کی زندگی میں بھی آ سکتا ہے۔ یہ کیوں نہیں سوچتے......'

☆ وہ تو ہے......'

— تو پھر گھر جاؤ۔ بڑی لکیر کاٹنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس سے بھی بڑی لکیر بنا دی جائے۔ تمہاری بیٹی کے سپنے کو کاٹنے کے لئے یہ ضروری ہے...... ' کہ اس سے بڑے سپنے کو کاٹ دیا جائے......

— 'ہاں ءءء' اندر کا آدمی اُداس تھا...... 'وہ شاید پریم بھی کرتی ہے اور پریم میں آگے بھی بڑھنا چاہتی ہے۔

اس کی خبر لو۔ اس کے سپنے کو توڑ دو۔ بڑا سپنا چھوٹے سپنے کو کھا جائے گا......

آواز چپ تھی......

آواز بے حرکت تھی......

باپ کے قدم شل تھے......

جیسے اُس کے قدموں میں جان ہی نہ رہ گئی ہو۔

☆☆

باپ اس دن جلدی گھر آ جاتے ہیں۔

بیٹی کے پاس 'سپنا' آیا ہوا تھا

باپ کے خلاف معمول گھر آنے سے' بیٹی گھبرا گئی تھی۔

'سپنا' بوکھلا گیا تھا۔

بیٹی ہکلا رہی تھی ...... آپ ...... پاپا......

باپ کا چہرہ شانت تھا۔لڑکے کا سر جھکا ہوا تھا۔

''جاؤ بیٹی تم چائے بناؤ۔اور ہاں میں تمہیں آواز دیکر بلا لونگا۔سمجھ گئی نا۔''

باپ حیران پریشان سے لڑکے کی طرف گھومے تھے۔

'تم ...... تم میری بیٹی سے......'

'ہاں......'

باپ مطمئن تھے۔'لیکن کیا تم جانتے ہو کے زمانہ......'

'زمانہ......'لڑکا ڈرا ہوا تھا۔

'ہاں زمانہ۔جہیز...... جہیز جانتے ہو۔؟

'جی۔'

باپ کی آواز شانت لہروں کی طرح تھی ......تم ایسے محبت نہیں کر سکتے۔قطعی نہیں۔سمجھ رہے ہونا...... زمانہ بدل رہا ہے۔تو طے ہے تم اس سے محبت کرتے ہو۔؟

'ہاں'

''تو پھر جہیز دینے کے لئے تیار ہو جاؤ۔محبت کے لئے جہیز۔تعجب مت کرو۔تمہارے نئے زمانے کی مجبوری ہے۔

تم اُس کے لئے ایک ٹی وی لے آؤ۔بلیک اینڈ وہائٹ بھی چلے گا۔اور اس کے بغیر

.....سمجھ رہے ہونا۔ تم اس سے محبت نہیں کر سکتے۔؟''

باپ کمرے سے نکل رہے تھے۔

لڑکی چائے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہو رہی تھی۔

لڑکا حیرت سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

ظلمت کدہ

دن کے تقریباً گیارہ بجے کا وقت تھا۔ سڑک دھوپ میں نہائی ہوئی تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے آگے کی جانب رواں تھی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ جیسے وہ بُد بُد اتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ تین بچے تھے جو سڑک پر ننگے پاؤں اپنی ماں کے ساتھ چل رہے تھے۔ اُس کے چہرے پر پریشانیاں عیاں تھیں۔

میں بھی اُسی راستے پیدل جا رہے تھا۔ اُس عورت کے پریشان کن چہرے کا جائزہ لے کر میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ شاید یہ کوئی مظلوم عورت ہے...... شاید وقت کی گردش نے اس کے ساتھ گندہ مذاق کیا تھا۔ بچوں کے جسم پر کپڑے پھٹے پُرانے تھے۔ اُس عورت کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی...... شاید 26 سے 30 کے درمیان...... لیکن وقت نے اس کے چہرے پر جھرّیاں پیدا کر دی تھیں۔

اچانک میں چونک پڑا ہوں۔ اُس عورت کی چیخ گونجی ہے۔ شاید چلتے اور بُد بداتے ہوئے اُس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو۔ اُس کے ہونٹ اب بھی پھڑک رہے ہیں...... ہونٹوں پر کپکپی ہے۔ اُس کی آواز صاف نہیں نکل رہی ہے۔ مجھے لگا' جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مجھے کچھ بتانا چاہتی ہے۔ میں پلٹ کر اُس عورت کی جانب مُڑا ہوں...... تو اس کی لرزتی آنکھیں آنسوؤں کے جھلملاتے قطرے بہانے لگیں اور پورا چہرہ آنسوؤں سے نہا گیا تھا۔ پھر میں نے اس سے پوچھ لیا......

''کیا آپ نے مجھ سے کچھ کہا......''

''نہیں......میں اپنی قسمت کو کہہ رہی ہوں''......

پھر اس عورت نے اپنے پتی پر ہونے والے ظلم کی وہ داستان سنائی، جسے سُن کر میرا دل اور دماغ دونوں زخمی ہو گیا ہے......میں سوچنے لگا......کیا دلت انسان نہیں ہیں......کیا دلتوں کو ہندستان میں آزادی سے جینے کا حق نہیں......کیا ان کی رگوں میں دوڑنے والے خون کا رنگ سرخ نہیں......کیا ان کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا حق نہیں......اگر ہے تو ان معصوم بچوں کے منہ کا نوالہ کیوں چھن گیا......کیوں انہیں دو وقت کی روٹی میسر نہیں......کیوں ان بچوں کا بستہ چھن گیا......کیوں ان بچوں کے مستقبل میں تاریکیوں کی کالی چادر ڈال دی گئی۔ کیوں......آخر کیوں......؟ جتنا میں سوچ رہا ہوں۔ اتنا ہی اُلجھ رہا ہوں ۔کہیں فرقہ پرستی کا جنون سرچڑھ کر بول رہا ہے اور یہ جنون پورے ملک کے لئے، اور اس کی خوشحالی کے لئے نقصان ثابت ہوگا......کہیں ذات پات کا جھگڑا ہندستانیوں کی ایکتا میں رکاوٹ پیدا کر رہا ہے......

قارئین، اس عورت نے اپنی جو درد بھری کہانی سُنائی۔ اس کہانی کا کچھ حصہ آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں......

☆☆☆

رامو صحت مند دلت نوجوان تھا۔ وہ چمڑے کا بیگ بناتا تھا۔ وہ اپنے کام میں اس قدر ماہر تھا کہ کوئی نقص نہیں نکلتا۔ وہ نجف گڑھ کی جھگیوں میں رہتا تھا۔ جس کے سامنے، سڑک کی دوسری جانب اونچی ذات کے لوگ رہتے تھے۔ رامو دن رات خوب کمار رہا تھا۔ اس کے

ماں باپ گزر چکے تھے...... اس کی شادی بسمتیا سے ہوئی تھی۔ بسمتیا جیسے اس کے مقدر کے لئے لکشمی ثابت ہوئی تھی۔ رامو کبھی خالی نہیں بیٹھا۔ بسمتیا کے آتے ہی جیسے رامو کی زندگی میں کام کی باڑھ آ گئی۔ وہ محنت و مشقت سے کام کرنے لگا۔ آمدنی اپنی ضرورت سے زیادہ ہونے لگی...... چھٹی کے دونوں میں اپنی بیوی کو رامو خاص خاص اتہاسک جگہیں دکھانے لے جاتا۔ سیر و تفریح کراتا۔ بسمتیا بے حد خوش تھی' کیونکہ اس کی زندگی میں خوشیاں رقص کر ہی تھیں۔ اس کا پتی بھی ہمیشہ اس کا خیال رکھتا تھا۔ کام سے فارغ ہوتے ہی وہ سیدھا گھر آ جاتا تھا اور بسمتیا کے کام میں ہاتھ بٹاتا...... کچھ ہی لمحوں بعد بسمتیا تخت زمین پر رکھتی' کھانا پروستی' پانی رکھتی اور رامو تخت پر براجمان ہو جاتا۔ وہ ساتھ ساتھ بسمتیا کو کھانے کے لئے کہتا 'تو وہ کہتی...... پہلے پتی کو کھانا چاہئے وہ اپنا پتنی دھرم نبھا رہی ہے...... رامو کے ضد کرنے پر وہ اس کا ساتھ دینے بیٹھ جاتی۔ دونوں کی زندگی ہنسی خوشی گزر رہی تھی...... ایک دن بسمتیا رامو کے کان میں کچھ کہتی ہے' وہ بہت خوش ہوا۔ بسمتیا نے آنے والے نئے مہمان کی خبر دی تھی۔ جو اس کی کوکھ میں پل رہا تھا۔ اب اُس ننھے منے مہمان کی کلکاریاں گھر میں گونجیں گی۔ رامو کام پر چلا جاتا تھا' تو بسمتیا اکیلا پن محسوس کرتی تھی۔ اب کچھ دنوں بعد ایسا نہیں ہوگا...... اُس دن کے بعد سے ہی رامو گھر کچھ پہلے آ جاتا' بسمتیا کا پورا پورا خیال رکھتا۔ اُسے کوئی بھاری چیز نہیں اُٹھانے دیتا اور اُسے تاکید کر جاتا کہ...... خبردار' کوئی بھاری چیز مت اُٹھانا...... 'اپنے پتی کا بھرپور پیار پا کر وہ اپنے آپ کو دنیا کی سب سے خوش نصیب عورت سمجھ رہی تھی...... اور وہ وقت بھی آ گیا' گھر میں ننھی منّی کلکاریاں گونجنے لگیں...... اب بسمتیا کی گود میں ایک ننھی منّی بچی تھی...... رامو اپنی بیٹی سے بہت خُوش تھا۔ شام کے وقت کام سے فارغ

ہو کر جب گھر آتا تو پہلے ایک نظر اپنی پھول سی بیٹی کو ضرور دیکھ لیتا اور پیار کرتا، پھر ہاتھ منہ دھوتا......

نگمیتا دو سال کی ہو چکی تھی۔ اپنے پاپا، ممی کی لاڈلی بیٹی، جس کو دونوں کا برابر پیار ملا تھا۔ وہ توتلی زبان، بول کر اپنے پاپا ممی کا دل بہلاتی تھی۔

چار سال کی ہوتے ہی نگمیتا کا داخلہ پرائیوٹ اسکول کے نرسری کلاس میں کرایا گیا۔ اس درمیان بسمیتا کی گود میں نگمیتا کا بھائی ونے آچکا تھا۔

رامو حسب معمول کام پر جاتا اور اتنا کما کر لاتا کہ گھر کے سارے اخراجات، نگمیتا کی پڑھائی کی فیس وغیرہ ادا کرنے کے باوجود ہر مہینے اچھی خاصی رقم بچ جاتی۔ اس کے پڑوس والے اس کی کمائی سے متاثر تھے۔ پڑوس کے دس گھروں سے موازنہ کرنے پر پتہ چلا کہ ان سب میں رامو کا گھر خوشحال ہے۔ اور خوشحالی کا راز رامو کی محنت اور اس کی بیوی کا پیار اور حوصلہ افزائی تھی۔ رامو کو اپنی کمائی پر فخر تو تھا ہی، ساتھ ہی ساتھ اس کے کئی سپنے بھی تھے......

قارئین، ان سپنوں کا تذکرہ رامو کے ان خوابوں میں ہوگا جب وہ اپنی مایوس زندگی سے دوچار ہوگا......اور چاروں طرف اُسے بھوک کا تانڈو نظر آئے گا۔ وہ اپنی مجبوری، لاچاری اور بے بسی میں اپنے بچوں کا مستقبل بکھرتا ہوا محسوس کرے گا۔

رامو اور بسمتیا اپنے بچوں کے ساتھ سکھی جیون گزار رہے تھے۔ رامو کا بیٹا ونے بھی بے حد ذہین تھا۔ وہ جو کچھ بھی سُن لیتا اس کے حافظہ میں رہتا۔ وقت گزرتا گیا۔ دن، ہفتے، پکھواڑے مہینے، سال اور پھر دوسرا، تیسرا اور چوتھا سال۔ اب رامو کے تین بچے ہیں۔ رامو کی کمائی میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں مشینوں جیسی پھرتی

ہے۔اس کے پریوار میں کل پانچ لوگ ہیں۔ راموکی کمائی کا آدھا حصہ بچ جاتا ہے۔ان روپوں کو وہ مستقبل کے لئے جمع کر رہا ہے......راموا اور بسمتیا ایسا جیون ہمیشہ کے لئے چاہتے ہیں۔وہ جیون کے سنگھرش میں ایک ایسا ہی سکھی کارواں کے ساتھ زندگی کی باقی منزلیں طے کریں گے......راموکے تینوں بچے پرائیوٹ اسکول میں پڑھتے ہیں۔

راموکی زندگی میں خوشیوں کی بارش ہو رہی تھیں۔ اور پڑوس والوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔شاید کچھ لوگوں میں حرص وطمع سراُبھارنے لگی تھیں۔ایسا راموا اپنے پڑوس کے دلتوں میں محسوس کررہا تھا......لیکن راموان باتوں پر زرا بھی دھیان نہیں دیتا اور وہ اپنی دُھن اور لگن میں رہا......اسی درمیان بسمتیا نے چوتھے مہمان کی خبر دی' یعنی' بسمتیا کی گود میں پھر ننھا منّا کھیلنے کے لئے' دنیا میں جنم لینے والا تھا......دونوں نے مل کر فیصلہ کیا ' آنے والے وقت میں وہ دونوں اور بچے پیدا نہیں کریں گے' وہ سکھی پریوار کی تدبیر کریں گے......

جھگی پٹی میں جگہ جگہ ہینڈ پمپ تو تھے ہی' اور سڑک کی دوسری جانب سپلائی واٹر کا نل لگا تھا ' جس سے جھگی والے بھی پانی لیتے تھے۔اُس نل کے پاس ہی اونچی ذات والوں کے مکانات تھے۔خوبصورت اور عالیشان مکانات......

ایک دن راموشام میں کام سے فارغ ہو کر واپس آیا اور گھر میں کپڑے تبدیل کر رہا تھا کہ سامنے سے کچھ لوگوں نے راموکو آواز لگائی۔ راموا اپنی جھگی سے باہر نکلا۔آواز لگانے والے راموسے کچھ پوچھ تاچھ کرنے لگے اور اسی پوچھ تاچھ کے درمیان بات حد سے زیادہ بگڑ گئی۔ان لوگوں نے راموپر الزام لگایا سڑک کے کنارے جو نل تھا وہ غائب ہے' یہ سب تو

نے کیا ہے' تو اس جگہ پر جلدی سے نل لگا دے۔ رامو نے نفی میں سر ہلا دیا اور کہا...... ایسا میں نے کچھ بھی نہیں کیا' میں تو ابھی کام سے واپس لوٹا ہوں ...... آہستہ آہستہ یہ موضوع بحث وتکرار کی شکل اختیار کر گیا...... شور سُن کر بسمتیا جھگی سے باہر آ گئی' اُس نے دیکھا کتنے ہی لوگ راموکو مارنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ رامو ہر بار ایک ہی جملہ دُہرا رہا ہے...... لیکن اس کی بات کوئی بھی سُننے یا ماننے کو تیار نہیں......

بسمتیا کو لگا' اب حالات زیادہ بھیانک ہونے والے ہیں' تو وہ اپنے پڑوس میں' جہاں سارے دلت رہتے تھے' یعنی اس کی قوم والے' جو یہ شور سن کر بھی خاموش تھے۔ جو اپنی جھگیوں میں دُبکے پڑے تھے۔ بسمتیا پہلے پڑوس کے ارجن کے پاس گئی اور کافی منت وسماجت کی......

......بھیا' انھیں بچالو...... ورنہ وہ ظالم لوگ انہیں مار ڈالیں گے......

ارجن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بُت بنا کھڑا رہا......

بسمتیا پھر دوسرے پڑوس کے دروازے پر دستک دینے لگی۔ شمبھو چاچا بھگوان کے لئے دروازہ کھولو' تم لوگ چلو اور انہیں بچالو......

بسمتیا دوسرے کے بعد تیسرے' چوتھے' پانچویں' چھٹے اس طرح اُس نے کئی دروازوں پر دستک دی اور بھگوان کا واسطہ دیا' لیکن سب بے سود۔ جیسے وہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔ جیسے بزدلوں کی بستی ہے۔

بسمتیا اب سوچ رہی ہے یہ لوگ کتنے ڈرپوک اور کایر ہیں' جو اپنے بھائی بھیجتے کو موت سے جوجھنے کیلئے چھوڑ دیتے اور خود اپنے اپنے گھروں میں دبک جاتے ہیں......

اب بسمتیا پر خوف طاری ہو رہا ہے۔ کہیں اس کے رامو کے ساتھ اونچ نیچ نہ ہو جائے۔ اور وہ خوفزدہ لرزتی ہوئی اپنی جھگی کے پاس آئی ہے۔ رامو کو بُری طرح پیٹتے ہوئے دیکھ کر وہ بھیڑ میں جا گھسی ہے۔ ان سبھوں سے ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کی ہے—— بابو لوگ، ان کا کوئی قصور نہیں، میں بھی نہیں جانتی نل کس نے نکالا—— لیکن اس بات کا کوئی نوٹس نہ لے کر اس بھیڑ میں سے کسی نے سخت لہجے میں کہا ہے۔ چُپ رہ کُتیا 'تو اور تیرا پتی کتنا مکّار ہے۔ میں جانتا ہوں۔ آج میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ تیری قوم والے ہمارے گاؤں میں زندہ جلا دیئے جاتے ہیں—— اور پھر بسمتیا کو ایک سڑی سی گالی دی گئی ہے۔ اُسے ٹھوکر مارا گیا ہے۔ بسمتیا پیٹ کے بل گری ہے۔ وہاں پر بالٹی پڑی تھی، جس کی چوٹ بسمیتا کے پیٹ میں لگی ہے۔ وہ درد سے لوٹ پوٹ ہو گئی ہے اور اس کی زوردار چیخ گونجی ہے پھر اُس پر غشی طاری ہو گئی۔ جب اُس کی غشی دور ہوئی اور اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس کے درمیانی کپڑے خون آلود نظر آئے...... سامنے نگمیتا کھڑی ہے۔ وہ اپنی ماں کے خون آلود کپڑے دیکھ کر بھونچکی رہ گئی ہے۔ دونوں بیٹے رامو کے پاس کھڑے ہیں۔ رامو بھی درد سے بے چین ہو رہا ہے۔ اس کا بازو ٹوٹ چکا ہے۔

بسمتیا کسی طرح خون آلود کپڑوں کے ساتھ اٹھی ہے۔ وہ ڈگمگاتی ہوئی رامو کی طرف بڑھ رہی ہے۔ رامو کا ٹوٹا بازو دیکھ کر کانپ سی گئی ہے۔ اُسے کسی طرح لے کر آٹو سے ہسپتال پہنچتی ہے۔ ساتھ میں اس کے بچے بھی ہیں۔ ہسپتال سے ڈاکٹر نے پولس کو اطلاع دے دی ہے۔ پولس آ گئی ہے۔ دونوں کا بیان درج کیا گیا ہے۔

نگمتیا کی نگاہ بسمتیا کے خون آلود کپڑے پر ٹکی ہے۔ اس نے آخر پوچھ لیا...... یہ کیسا خون

ہے'اماں ...... بسمتیا نے بیٹی کو سینے سے لگا لیا ہے۔ اور اپنی زبان سے اتنا کہہ پائی ہے
—— ہماری قسمت روٹھ گئی...... اور پھر وہ رونے لگی ہے۔

بسمتیا کا بھی علاج ہو رہا ہے۔ اس کی اندرونی صفائی کی گئی ہے۔ اس کا حمل ضائع ہو گیا ہے۔ اُسے 'انٹی بایوٹک' دوا دی جا رہی ہے۔ کئی ماہ تک علاج ہوا تب ٹھیک ہوئی ہے۔ رامو اپنے کام سے ناکارہ ہو چکا ہے۔

بسمتیا اب مقدمہ لڑ رہی ہے۔ اُسے وشواس ہے قانون اس کی مدد ضرور کرے گا۔ گنہگار کو سزا ضرور ملے گی۔ جتنے روپے اس نے جمع کر رکھے تھے' اب وہ نکال رہی ہے۔ بچوں کی پرورش انہیں پیسوں سے کر رہی ہے اور مقدمہ بھی لڑ رہی ہے۔ مقدمہ لڑتے ہوئے تین سال کا عرصہ گزر گیا۔ لیکن کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ بلکہ مقدمہ واپس لینے کے لئے اس پر دباؤ پڑ رہا ہے۔ پولس والے اُسے دھمکی دے جاتے ہیں۔ اپنا مقدمہ واپس لے لے...... بسمتیا پولس والوں کی دھمکی میں نہیں آ رہی ہے۔ وہ ہر تاریخ سماعت پر حاضر جاتی ہے۔ اس امید پر کہ مجرموں کو سزا ملے۔ لیکن تاریخ' تاریخ اور پھر تاریخ...... اس طرح بسمتیا کے پاس کا سارا پیسہ خرچ ہو چکا ہے۔ اب مقدمہ کی تاریخ پر جانے کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں۔ بچوں کا فاقہ ہو رہا ہے۔ بسمتیا اب محنت ومشقت کرنا چاہتی ہے تا کہ بچوں کی پرورش ہو سکے اور مقدمہ بھی لڑ سکے۔

قارئین!

بسمتیا کام کے لئے بھٹک رہی ہے۔ پریشان حال کئی جگہ پر گئی ہے۔ کہیں یہ کہہ دیا جاتا ہے' ضمانت دار لاؤ' کہیں 'کام نہیں ہے' کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے...... آخر کار اُسے کچھ کام گھر

پر لاکر کرنے کو مل گیا ہے۔ کسی دیاوان نے ماضی کا حال سن کر کام دیا ہے...... بٹوے میں ڈوری لگانے کا کام...... بسمتیا بٹوے میں ڈوری لگا رہی ہے۔ دن بھر میں وہ ساٹھ سے سو روپے تک کما لیتی ہے۔ بچوں کی پرورش کسی طرح ہو رہی ہے۔ دو وقت کی روٹی میسر ہو رہی ہے۔ اور پیسے وہ مقدمہ لڑنے کے لئے بچا رہی ہے...... بچوں کا بستہ اب اسکول سے بہت دور رہ گیا ہے...... ہاں، بہت دور...... بچے اب اسکول نہیں جاتے۔ ان کی فیس ادا کرنے کے لئے پیسے نہیں ہیں...... اس طرح ڈیڑھ سال کا عرصہ اور گذر گیا...... رامو کے بازو ٹوٹے اب تقریباً پانچ سال ہو چکے ہیں...... ادھر دو ماہ سے بٹوے کا کام بھی بند ہو چکا ہے...... ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ ہونے کے بعد سے ایکسپورٹ کے کام پر بے حد اثر پڑا ہے۔ دلّی سے کئی فیکٹریاں اُٹھ چکی ہیں...... بہت سارے لوگ دلّی کو الوداع کہہ گئے ہیں......

اب رامو کے گھر میں بھوک کا تانڈو جاری ہے۔ بچے بھوک سے بلک رہے ہیں۔ نگمتیا 'ونے اور راہل رامو کے پاس بیٹھے ہیں...... رامو اپنے بچوں کے معصوم چہرے دیکھ رہا ہے۔ وہ سوچ رہا ہے یہ بچے کل کیا تھے مگر آج کیا ہیں...... کل ان کی ہر آرزوئیں پوری کرنے کی تمنا تھی، مگر اب......؟ اب بھوک ان کی قسمت پر رقص کر رہی ہے......

رامو کے کتنے ارمان تھے۔ وہ محنت کرے گا...... دھن کمائے گا...... بچوں کو اچھی تعلیم و تربیت سے آشنا کرائے گا...... تینوں بچوں کو اعلیٰ مقام تک پہنچائے گا...... ایک اچھا سا گھر بنوائے گا...... جس میں وہ سب ہونگے...... زندگی کا کارواں آگے کی جانب رواں ہوگا...... گھر میں خوشیاں رقص کریں گی...... بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے' ڈاکٹر بنیں گے' انجینئر بنیں گے...... ملک کے خدمت گار بنیں گے...... رامو اور بسمتیا اپنے بچوں کو نیکی کا سبق دیں

گے...... تعلیم یافتہ بنا کر گاؤں میں ڈسپنسری کھلوائیں گے...... جس میں اس کا ایک بیٹا ڈاکٹر

ہوگا...... مریضوں کی تیمارداری کرے گا...... مگر...... سب ایک خواب رہ گیا۔ جب رامو

ماضی کے جھروکے سے بیدار ہوا تو اُسے لگا' اس کے بچے کٹورے لے کر بھیک مانگتے نظر

آرہے ہیں...... بھوک نے انہیں توڑ ڈالا ہے...... رامو اپنے بچوں کو غور سے دیکھ رہا ہے

۔اب وہاں پر نگمتیا نہیں ہے...... اُس کی دس سالہ بیٹی نگمتیا...... بسمتیا تو کام کی تلاش میں گئی

ہے...... مگر نگمتیا کہاں ہے...... وہ ماں کے ساتھ تو نہیں گئی تھی...... رامو اُٹھ کھڑا ہوا ہے

...... باہر آکر دیکھ رہا ہے...... نگمتیا آس پاس کہیں نظر نہیں آتی...... رامو مایوس بستر پر آلیٹا

ہے......

نگمتیا بھوک کی شدت سے بے چین ہو کر گھر سے نکل گئی ہے۔اُسے اپنے بھوکے

بھائیوں کا خیال آیا ہے...... وہ اپنے پڑوس کے ایک گھر میں آئی ہے...... رسوئی میں قدم رکھ

چکی ہے...... لیکن وہاں کچھ نہیں ملا...... بھوک کی شدت اُسے تڑپا رہی ہے...... پیٹ

میں اینٹھن ہو رہا ہے...... اب اُس نے بھوک مٹانے کے گناہ کا پکّا ارادہ کر لیا ہے......

بھوک تو کتنے ہی لوگوں کو گناہ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔وہ بھی آج مجبور

ہے...... بھوک کی شدت سے بیزار ہو کر کوئی چوری کرتا ہے...... کوئی ڈاکہ ڈالتا ہے...... کوئی

نشیلی اشیاء اسمگلنگ کرتا ہے...... ایمانداری سے اگر حاصل نہ ہو تو بے ایمانی کرتا ہے

...... عورتیں اپنی عصمت چند روپوں کی خاطر بیچ آتی ہیں...... یعنی وقت کا طمانچہ دنیا کا ہر گناہ

کرنے پر مجبور کرتا ہے...... نگمتیا بھی وقت کی مار اور بھوک سہہ نہیں پا رہی ہے...... دوسرے

پڑوس کے گھر چلی گئی ہے...... وہاں رسوئی میں گئی ہے...... اُسے کچھ روٹیاں مل گئیں...... وہ

روٹی لے کر باہر آ گئی ...... اُس گھر کے بچوں نے نگمتیا کو دیکھ لیا ہے ...... بچوں نے شور مچایا ہے ...... نگمتیا روٹی چوری کر کے لے جا رہی ہے ...... وہ دوڑی دوڑی اپنے گھر آ گئی ہے ...... رامو پر نیند کا غلبہ طاری ہے ...... نگمتیا روٹی اپنے بھائیوں کو کھلاتی ہے ...... چند نوالے اس نے بھی کھائے ہیں ...... بچوں کو روٹی ملنے سے کچھ سکون ملا ہے ...... اب بچے لیٹ گئے اور پھر سو چکے ہیں ——

بسمتیا گھر آ گئی ہے ...... وہ پڑوسن بھی چیختی ہوئی آئی ہے ...... اس نے نگمتیا کو چور کہا ہے ...... اور بسمتیا کو بھدّی بھدّی گالیاں دی ہے ...... پھر پڑوسن باہر نکل گئی ہے اور اڑوس پڑوس کو اکھٹا کر کے لمبی داستان سُنا رہی ہے ...... روٹی چوری کی داستان ——

بسمتیا کا صبر جواب دے چکا ہے۔ اس کی چیخ گونجی ہے ...... وہ نگمتیا پر برس پڑی ہے ...... اُسے پٹخ پٹخ کر مارا ہے ...... کپڑے دھبوں سے بھرے ہیں ...... خون آلود دھبے ...... بسمتیا نے چوٹی پکڑ کر نگمتیا کو گھسیٹ مارا ہے ...... اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے ہیں ...... خون جہاں تہاں سے رس رہا ہے ...... پھر بھی بسمتیا اس پر برستی جا رہی ہے ...... رامو اُٹھ چکا ہے ...... وہ ایک ہاتھ سے بیچ بچاؤ کرنے کی کوشش کر رہا ہے ...... بیچ بچاؤ سے بسمتیا شانت ہو گئی ہے ...... مگر نگمتیا کا جسم نیلا پڑ چکا ہے ...... وہ خوفزدہ ہے ...... اس کی گھگھیاں بندھ گئی ہیں ...... پھر بسمتیا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ہے ...... رامو کی بھی آنکھیں نم ہو چکی ہیں ——

رات کا وقت ہے۔ گھر میں کھانے پکانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے ...... بسمتیا کے بھاگ دوڑ کے باوجود آج بھی کام نہیں ملا ...... دونوں بچے بھوکے سو چکے ہیں ...... نگمتیا کی

سسکیاں جاری ہیں......بسمتیا کے دلوں میں ممتا جاگی ہے......وہ نگمتیا کے قریب گئی ہے

......اُس کی بالوں میں اپنی انگلیوں کا کنگھا کیا ہے......پھر آہستہ آہستہ اس کے سر پر ہاتھ

پھیرا ہے......اس کے جسم کو سہلایا ہے......نگمتیا کو اپنے سینے سے لگایا ہے......نگمتیا سسکیاں

لیتی ہوئی بول پڑی ہے......اماں اب میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گی، جس سے آپ کو دُکھی

ہونا پڑے......آپ کو چور کی ماں نہیں کہلواؤں گی......بسمتیا کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز

ہو چکی ہیں......اُس نے نگمتیا کو اور بھی پیار کیا ہے——

اب، بسمتیا ان لوگوں کو کوس رہی ہے......ان کی وجہ سے اس کا بے قصور پتی اپنا ہاتھ گنوا دیا

......اور اس کا حمل ضائع ہوا......یعنی ایک انجان معصوم کا خون......جس نے دنیا دیکھنے سے

پہلے ہی ماں کی اندھیری کوٹھری میں دم توڑ دیا ......بسمتیا کی کوکھ پر چوٹ پڑی......اور وہ

خون کی دھار بن کر باہر بہہ نکلا......علاج کے بعد بچوں کے لئے دو وقت کی روٹی کا اور

مقدمہ کا مسئلہ درپیش آیا......پھر دن، مہینے اور سال گزرتے گئے......پیسے ختم ہو گئے......بچے

بھوک کی مار سہنے لگے......اور گھر میں بھوک کا رقص ہونے لگا......بچوں کا بستہ چھن گیا

......بچوں کے روشن اور تابناک مستقبل کا خواب ریت کے گھروندہ کی مانند بکھر گیا......اب

نہ بچے اسکول جاتے ہیں......اور نہ دو وقت کی روٹی میسر ہے......

اب بسمتیا اپنے خیالوں سے بیدار ہو چکی ہے۔کل مقدمہ کی تاریخ ہے۔گھر میں تو

بھوک رقص کر رہی ہے تو پھر نجف گڑھ سے کچہری تک جانے کا کرایہ کہاں سے لائے......

وہ سوچ کے بھنور میں الجھ رہی ہے......اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے......اُسے لگا' اب وہ

ہار چکی ہے......ایک عورت......ایک بے بس عورت کیا کر سکتی ہے۔وہ ظلم کی بربریت کے

خلاف مقدمہ لڑ رہی تھی۔ مگر......؟

صبح کے وقت وہ اپنے صندوق اور دیگر گدڑیوں کی تلاشی لے رہی ہے۔ شاید مقدمے کی تاریخ پر جانے کے لئے کوئی صورت نکل آئے ......اچانک وہ چونک گئی ہے......اُسے گدڑیوں میں تین سو روپے ملے ہیں......ایشور نے اس کی پرارتھنا سُن لی ہے......اب مقدمہ کی تاریخ پر وہ جائے گی ......بچوں کو دو دو نوالے کھلائے گی......پھر اُس نے فیصلہ کرلیا' اب وہ اپنے تینوں بچوں کے ساتھ عدالت جائے گی۔۔۔

وہ اپنے بچوں کے ساتھ بس سے اُتری ہے ......وہ بُد بُداتے ہوئے کچہری کی طرف سڑک پر بڑھ رہی ہے......تقریباً ساڑھے گیارہ بجے کا وقت ہے......دھوپ میں بڑی حدّت ہے......دھوپ میں پیدل' میں بھی چل رہا ہوں......وہ عورت میرے بغل میں بُد بُداتے چلی جارہی ہے۔ بچے میلے اور پھٹے کپڑے پہنے ہوئے ہیں......بھوکے ننگے بچے ......بچوں کے ہونٹ خشک ہو چکے ہیں......پیر میں چپل تک نہیں......تپتی سڑک کے کنارے کنارے اپنی ماں کے ساتھ دوڑے بھاگے چل رہے ہیں......اچانک اس عورت کی بڑبڑاہٹ تیز ہوگئی ہے......میں نے پلٹ کر اُسے دیکھا ہے۔۔۔اُس نے پتی پر اور اپنے آپ پر اور بچوں پر ہونے والے ظلم کی داستان سُنائی' وہ پانچ سال سے جوجھ رہی ہے ......

قارئین!

بسمتیا کی یہ کہانی سن کر میرا دل اور دماغ دونوں زخمی ہو چکا ہے۔ کبھی اس کی زندگی میں خوشیاں رقص کررہی تھیں......اب پسماندگی ہے......میں تو ایک غریب ماسٹر ہوں......

میں خود پریشان حال ہوں۔ اس وجہ سے میں اس کا کوئی مدد نہیں کر سکا...... ویسے دیس کی حالت بھی نازک ہے...... کہیں کہیں ذات پات کا بھید بھاؤ اب بھی سر اُبھارے ہے۔ کہیں فرقہ پرستی کا جنون سر چڑھ کر بول رہا ہے...... کہیں نوٹوں کے بل پر ناممکن کو بھی ممکن بنا لیا جاتا ہے...... اور سچ پر جھوٹ فاتح ہو جاتا ہے...... ایسے دور میں کیا بسمتیا کے ساتھ انصاف کی امید کی جا سکتی ہے......؟ آپ خود سوچئے۔

وہ تپتی دھوپ میں بچوں کے ساتھ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اور کہہ رہی ہے...... آج میں جج سے انصاف مانگ کر رہوں گی...... اپنے بچوں کا بھوشیہ مانگونگی...... اگر مجھے انصاف نہیں ملا تو میں خود اور اپنے بچوں کو بھی کبھی نہ اُٹھنے والی نیند سلا دوں گی...... وہ عدالت کے احاطے کے قریب پہنچ چکی ہے...... میں اپنے راستے چل پڑا ہوں اور وہ عدالت کے احاطے میں داخل ہو چکی ہے——

تبدیلی

ایک سایہ آگے کی جانب رواں تھا۔ سناٹے میں اس کے قدموں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اب وہ رہائشی علاقے میں پہنچ چکا تھا۔ آبادی نیند کی آغوش میں تھی۔ یہاں چاروں طرف گہرا سناٹا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ مکانوں کی کھڑکیاں بند تھیں لیکن برقی روشنی کھڑکیوں سے چھن چھن کر آرہی تھی ۔ سڑکوں کے منہ کھلے تھے۔ کبھی کبھی ٹریفک کی بوجھل آوازیں زہر بن کر فضا میں خوف پیدا کردیتی تھیں۔ سردی کی ٹھٹھرتی رات میں وہ تیز قدموں سے آگے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ایک مکان کے سامنے وہ ٹھہر گیا، پھر وہ آہستہ آہستہ دروازے پر دستک دینے لگا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ خاموشی سے اندر داخل ہوگیا۔

یہ مکان مسٹر ونود کا تھا۔

ونود اس علاقہ میں نو سال پہلے اپنی ماں کے ساتھ آیا تھا۔ آٹھ سال پہلے اس کی شادی رادھیکا سے ہوئی تھی۔ شادی کے چند مہینوں بعد ہی ونود کی ماں کا دیہانت ہوگیا تھا۔ رادھیکا آزاد خیال تھی۔ ونود کی آمدنی محدود تھی، پھر بھی ونود اس کی خوشیوں کا ہر صورت خیال رکھتا ۔ رادھیکا کی آرزوؤں کے پیش نظر ونود کی آمدنی ناکافی تھی۔

ڈیڑھ سال بعد رادھیکا کی گود ہری ہوئی، یعنی ونود کے آشیانہ میں ننھی کلکاریاں گونجنے لگیں۔

شام میں ونود جب گھر لوٹتا، اپنا پیار بیٹے ونٹی پر نچھاور کردیتا۔ گھنٹوں اس سے کھیلتا۔ اپنا دل بہلاتا۔ اس طرح وہ ساری تھکن بھول جاتا۔

رادھیکا کی فرمائش بڑھتی گئی، جس سے ونود پریشان رہنے لگا تھا۔ ونود رادھیکا کو سمجھاتا بھی، مگر رادھیکا کی نت نئی خواہشوں نے اس کی آنکھوں میں پردہ ڈال دیا تھا۔ رادھیکا کے سپنے آرزوئیں ایسی تھیں جو اعلیٰ طبقے کے امیر گھرانوں میں ہوا کرتی ہیں۔ جو اس کے لئے پورا کرنا ناممکن تھا۔ پھر بھی وہ اسے مقامی جگہوں پر سیر وتفریح کے لئے لے جاتا۔ لیکن رادھیکا کی آرزوؤں کی تکمیل ہوتی نظر نہیں آتی۔

ونود اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لئے کوشاں تھا۔ وہ اپنے دفتر میں لگن اور محنت سے کام کرتے ہوئے اوور ٹائم بھی کرنے لگا تھا۔ جس سے اس کی آمدنی میں معمولی اضافہ ہوا۔ لیکن رادھیکا پہلے گھریلو ضروریات کو پورا کرنے کے بجائے آمدنی کا زیادہ حصہ اپنی ذاتی خریداری میں صرف کردیتی تھی۔ اس طرح تین سال کا عرصہ گزر گیا۔ لیکن رادھیکا میں کوئی سدھار نہیں ہوا۔

ایک دن ونود نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ونٹی بڑا ہو رہا ہے ہمیں اس کے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ کچھ دنوں بعد اس کا داخلہ اسکول میں کرانا ہوگا۔

ونود کی بات پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بجائے وہ جھلا کر بولی۔

"پھر شادی کیوں کی تھی۔" ......

رادھیکا نے اسے چپ کردیا تھا۔

شادی سے پہلے ونود کے کیسے کیسے سپنے تھے...... ایک گھر ہوگا...... پیارا گھر...... محبت سے بھرا گھر...... جس میں وہ ہوگا...... ساتھ میں شریک ہمسفر ہوگی...... بچے ہوں گے...... ہنستے کھیلتے بچے...... سب مل کر زندگی کے کارواں کو آگے بڑھائیں گے...... ایک سکھی سنسار بسائیں گے......

رادھیکا کا بھی سپنا تھا...... میں اپنے پتی کے ساتھ کلبوں میں جاؤں گی...... نئے نئے فیشن کروں گی...... ہل اسٹیشنوں پر جاؤں گی...... دیس بدیس کی سیر کروں گی...... بنگلہ ہوگا...... موٹر گاڑی ہوگی...... نوکر چاکر ہوں گے...... مہارانی بنی حکم کروں گی...... عیش وعشرت کی زندگی گزاروں گی۔

دونوں کی سوچ وفکر میں کتنا تضاد تھا۔ رادھیکا نئے زمانے کی چکا چوند میں گھر گرہستی بھول گئی تھی اور ونود کو گھر گرہستی کی فکر تھی۔

آخر کار ونود نے اس نوکری کو چھوڑ دیا۔ اسے بڑی کوششوں سے دوسری نوکری زیادہ آمدنی والی مل گئی تھی۔ اب اسے فلڈ ورک میں دور دراز بھی جانا پڑتا۔ دور دراز جانے پر اسے خوراکی اور ٹور الاٹمنٹ بھی ملتا۔ اس رقم کا کچھ حصہ گھریلو کام میں آجاتا۔

اس کے باوجود رادھیکا ونود سے خوش نہیں تھی۔ بلکہ آہستہ آہستہ دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جارہا تھا۔

ونود رادھیکا سے پریشان ضرور تھا۔ لیکن اسے یقین تھا، آج نہیں تو کل وہ اپنے پتی کا، اپنے بیٹے کا خیال ضرور کرے گی۔ اپنے گھر گرہستی کو ضرور سمجھے گی۔ جس کیلئے وہ اپنے دل میں دعاؤں کے شجر اگا رہا تھا۔ لیکن اصل کہانی ونٹی کے آنے کے بعد شروع ہوگی۔ بس ایک

چھوٹا سا واقعہ۔

ونٹی چھ سال کا ہو چکا تھا اور اسکول بھی جانے لگا تھا۔ وہ نہایت ہی ذہین تھا۔ اسے جو کچھ بھی پیار ملتا۔ وہ ونود سے۔ رادھیکا کی بے توجہی ونٹی کے سمجھ سے باہر تھی۔

ایک دن ونود نے مسٹر ولسن کو اپنے گھر مدعو کیا۔ مسٹر ولسن ہی کی وجہ سے ونود اس مقام تک پہنچا تھا۔

مسٹر ولسن بھی رادھیکا کی طرح آزاد خیال تھا۔ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ شادی کی بندش میں مقید ہونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ عیش و موج کی زندگی کو ترجیح دیتا تھا۔

ونود نے ولسن کی خاطر تواضع کے لئے طرح طرح کی لذیذ ڈیشیں تیار کرائی تھیں۔ ولسن آ چکا تھا۔

رادھیکا نے اپنی پسند کا لباس پہنا تھا۔ وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ نیم عریاں رادھیکا کھانا پروس رہی تھی اور ولسن کی نگاہ اس کے سڈول جسم، گداز بازو اور سینے میں اٹھے دو قبۂ نور پر تھا۔ ولسن تو جیسے رادھیکا کے اٹھتے شباب میں محو ہو گیا تھا۔

رادھیکا بھی ولسن کی باتوں سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔

دعوت کا دور ختم ہوا۔ اور ولسن خوشی کا اظہار کرتا ہوا پھر ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

دوسرے دن ونود اپنے کام پر گیا۔ اسے چار دن کے لئے فلڈ ورک میں جانا تھا۔ اسی درمیان ونود کی غیر موجودگی میں ولسن کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ رادھیکا کو ولسن اچھا لگا اور ولسن کو رادھیکا۔ کیونکہ دونوں آزاد خیال تھے۔ ولسن کے پاس دولت تھی اور رادھیکا کی آرزوئیں پوری کرنے کی تمنا۔

ونود ایک دو دن کے لئے آتا تو ان کے حسین شاموں میں رکاوٹ پڑ جاتی اور ونود کے جاتے ہی ولسن کے ساتھ جام نخرے اور جلوے ہوتے۔

رادھیکا ولسن کے ساتھ نیم عریاں لباس پہن کر کلبوں میں بھی جانے لگی۔ جہاں تر و تازہ دلنشین چہرے کیف و سرور کی فضا ہوتی۔ رقص و سرور کے ساتھ تھرکتے ہوئے ڈانس فلور پر پہنچ جاتے اور ایک دوسرے میں سب کچھ بھول جاتے۔

اب رادھیکا کی شامیں رنگین ہونے لگیں۔

جب ولسن رادھیکا کے کمرے میں ہوتا اور شام کے جام کے ساتھ ہنسی کی پھلجھڑیاں چھوڑتا تو اس وقت ونٹی کو دوسرے کمرے میں سلا دیا جاتا۔

ایک رات یعنی ٹھٹھرتی ہوئی سردی کی رات میں ولسن رادھیکا کے کمرے میں موجود تھا۔ رادھیکا عریاں لباس زیب تن کئے تھی۔ کمرے کے دروازے پر زور کی دستک ہوئی اور ونٹی کی آواز آئی......

''ممی دروازہ کھولئے......دروازہ کھولئے ممی۔''

رادھیکا چونکی......عجب سا منہ بناتی ہوئی جا کر دروازہ کھولا۔

......ممی مجھے سردی لگ رہی ہے۔ ڈر بھی لگ رہا ہے...... مجھے اپنے پاس سلاؤ ممی''۔

رادھیکا کے کچھ بولنے سے پہلے ونٹی بول پڑا تھا۔

''یہ بچہ''......تیز سردی کی حالت میں بھی ولسن کے پسینے چھوٹ گئے۔

بچے کی آواز پھر گونجی......''ممی......ممی مجھے ڈر لگ رہا ہے —''

''یہ بچہ......'' ونٹی کی آنکھیں اچانک اس کی آنکھوں میں اتر گئی تھیں......''سنو، مجھے اس

بچے سے خوف محسوس ہو رہا ہے......!"

"ممی ...... مجھے......" بچے کی آواز رونے جیسی ہوگئی تھی......

"میں جا رہا ہوں......"

ولسن نے اچانک فیصلہ کرلیا۔ اس کے قدم تیزی سے باہر کی طرف اٹھ گئے۔ ایک لمحہ کو

وہ رکا۔

"گڈ بائے۔ اس کے بعد شاید ہم......"

ولسن باہر نکل گیا۔

چٹاخ......اس نے لاشعوری طور پر بچے کی گال پر ایک چانٹا جڑ دیا ہے......

مگر یہ کیا......ہاتھوں میں کیسا لہو ہے۔

وہ واش بیسن میں چہرہ جھکائے ہاتھ دھو رہی ہے...... واش بیسن سے اوپر لگے مرر

میں بچے کا چہرہ اور ولسن کا چہرہ گڈ مڈ ہوتا ہے......پھر ایک کولاژ بن جاتا ہے۔

اچانک وہ سر کو جھٹکتی ہے۔

ہاتھوں میں اترا لہو بیسن سے بہتا ہوا پائپ سے کسی اور جانب نکل گیا ہے......

اب مرر میں اس کا چہرہ ہے۔ کولاژ غائب......

وہ مطمئن ہے۔ مڑ کر، پیار سے اپنے بچے کو آواز لگاتی ہے......اور آہستہ آہستہ بچے کی

جانب بڑھ جاتی ہے۔

آخری صفحہ

کہتے ہیں کتاب تنہائی کا ساتھی ہے۔ کتابوں کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ کتاب ہی انسان کو جینا سکھاتی ہے۔ ہم زندگی کے غمناک لمحے کو کتابوں میں محو کر کے بھول جاتے ہیں۔ اس لئے کتاب سے بہتر تنہائی کا کوئی دوست نہیں۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کم ازکم میں کسی حال میں نہیں گزرے دنوں میں، میں نے کتابوں کو ہی اپنا دوست بنایا اور زندگی کی ناساز گار ساعتوں کو بھلاتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ میں تخلیق کار بن گیا اور آپ تک یہ کتاب پہنچانے کے اہل ہو سکا۔

اس کتاب میں آپ نے جتنے بھی افسانے پڑھے، میں نے متعدد کتابوں، ناولوں اور افسانوں کو پڑھنے کے بعد اس سے متاثر ہو کر قلمبند کیا۔

اس کتاب کا ''عنوان کیمپ میں بچہ'' ہے۔ اس عنوان سے افسانہ مجموعہ میں شامل ہے اور اسے میں نے سعادت حسن منٹو کی کہانی ''کھول دو'' سے متاثر ہو کر قلم بند کیا۔ اس کتاب میں پسماندہ طبقے، پاکیزہ محبت بھرے افسانے اور دیگر روایتی افسانے ہیں جس سے آپ ضرور لطف اندوز ہوئے ہوں گے۔

انسان کی زندگی میں کتنے ہی غمناک اور خوشیوں کے لمحے آتے ہیں جو کہانی کا حصہ بن جاتے ہیں اور یہ حصے کہانی کی جان بن جاتے ہیں ساتھ ساتھ اسے خوبصورت اور حسین ترین بنا دیتے ہیں۔

میری زندگی میں ایسے کئی لمحے آئے۔ جب ماضی میں جاتا ہوں تو متعدد بھولی بسری

یادیں اُن لمحوں کو تازہ کر دیتی ہیں اور میں افسانوں کا تانا بانا بُننے میں لگ جاتا ہوں۔ کچھ لمحے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی ہی زندگی سے جڑے ہوتے ہیں لیکن ان کے بارے میں علم نہیں ہوتا۔ لیکن جب اس کے بارے میں اپنا کوئی بتاتا ہے تو وہ باتیں واقعی حیرت زدہ کر جاتی ہیں۔ جیسے وہ کوئی کرشمہ رونما ہوا ہو۔ ایسا ہی ایک حادثہ میری زندگی سے جڑا ہوا ہے۔ میری والدہ نے مجھ سے کہاں تھا ''اللہ نے تمھیں ایک نئی زندگی عطا کی ہے۔ جب تمہاری عمر تین چار سال کے درمیان رہی ہوگی۔ اُس وقت طویل علالت کے درمیان جیسے تمہارا حرکت قلب رک گیا تھا۔ نبض کی رفتار بند ہو چکی تھی اور تمہیں مردہ قرار دے دیا گیا تھا۔ گھر میں ماتمی ماحول چھا گیا تھا۔ گور و کفن کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ لوبہان بتی جلا دی گئی تھی کہ اچانک تمہارے رشتہ کی پھوپھی کی نگاہ آہستہ آہستہ حرکت کرتے ہوئے تمہارے دائیں ہاتھ کی انگلی پر پڑی تھی اور وہ قسمیں کھانے لگیں کہ اس میں جان باقی ہے۔۔ ڈاکٹر کو بلاؤ ۔۔ ارے کوئی ڈاکٹر کو بلاؤ اُن کے اس طرح شور مچانے پر وہاں موجود سب لوگ حیرت زدہ تھے ایک مردہ کیسے زندہ ہو سکتا ہے۔ اور مجھ میں بھی امید کی کرن جاگی تھی۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ ڈاکٹر نے فوراً جسم کو گرم کرنے کے لئے انجکشن لگایا اور گاؤں سے شہر کے بڑے ہسپتال میں لے جانے کے لئے کہا۔ تمہیں شہر کے بڑے ہسپتال پہنچایا گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کچھ ہی گھنٹوں بعد زندگی مسکرا اُٹھی۔۔ '' اور تب سے اب تک اس نبی احمد نے زندگی کی چالیس سے زائد بہار و خزاں دیکھ چکا ہے۔ اب نہ والدہ رہی اور نہ والد اور نہ اس حادثہ کا کوئی چشم دید بچا۔ سبھی اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اس حادثہ کو میں اپنے افسانے کا حصّہ بنانا چاہتا ہوں اور اس کا تانا بانا بُن رہا ہوں۔ اس طرح با ہوش زندگی میں اور بھی کئی حادثہ رونما ہوئے جو افسانے کے حصّے بن سکتے ہیں۔ جن میں ایک واقعہ 1990 کا ہے۔ جب میری اہلیہ سخت بیمار تھی۔ صدر ہسپتال اورنگ آباد بہار کے تمام ڈاکٹروں کی رات گیارہ بجے میٹنگ

ہوتی ہے اور مجھے صلاح دی جاتی ہے کہ آپ اپنی اہلیہ کو PMCH لے جائیں۔ پھر سرکاری ایمبولینس الاوَڈ کیا جاتا ہے اور میں مریضہ (اہلیہ) کو لے کر پٹنہ پہنچتا ہوں۔ کئی دنوں کے علاج کے بعد یہاں بھی نا اُمیدی ہی ہاتھ لگتی ہے۔ ہسپتال کے چیخ و پکار والے ماحول سے مریضہ بیزار ہو جاتی ہے۔ پندرہ دنوں کے بعد اُسی حالت میں وہاں سے باہر نکال لاتا ہوں ۔ پھر اس کے بعد کیا ہوا۔ نا اُمیدی کو چار مہینے بعد ایک ہنستی مسکراتی زندگی کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے بیٹا 'وقار' عطا کیا اور گھر میں ننھے منّے کلکاریوں کے ساتھ ہنستا مسکراتا طوفان آ جاتا ہے، پھر اس طوفان کے آغوش میں سارا دکھ اور غم بھول جاتا ہوں۔ یہ میرے افسانے کا حصہ بن سکتے ہیں۔

مجھے حقیقت نگاری پر مبنی افسانے قلمبند کرنے میں خوشی محسوس ہوتی ہے۔ آپ کو اس کتاب میں تقریباً ہر افسانے میں حقیقت کی جھلک نظر آئیں گی جو زمانے میں رونما ہو رہے ہیں۔

آخر میں آپ سے عرض کر دوں کہ اگر فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ اس کتاب کی منظوری نہیں دیتی تو پتہ نہیں میرا پہلا شاہکار کب اور کیسے آپ کے ہاتھوں میں آتا، کہہ نہیں سکتا کیونکہ پریشانیوں نے مجھے اپنا دوست بنا لیا ہے اور اس دوستی کو نبھاتے ہوئے زندگی کے بہت سارے کام جہاں کہیں رُکے پڑے رہ گئے ۔ لہٰذا میں کمیٹی کا اس کتاب کی اشاعت کی منظوری اور مالی تعاون کے لئے بیحد مشکور و ممنون ہوں اور امید ہے آپ حضرات بھی اس خاکسار کے لئے اپنے اپنے دلوں میں تھوڑی سی جگہ بنا کر اپنی اپنی رائے سے بھی نوازیں گے۔

خاکسار

نبی احمد

نبی احمد